كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ

بفضلہٖ و منہٖ

مقدمۂ

تفسیرِ روح الایمان فی تشریحِ آیاتِ القرآن

جس میں

قرآن شریف کے نزول اسکی جمع ترتیب تہذیب قرأت کتابت و اشاعت و رسم الخط کے اصول وغیرہ

جمیع مضامین ضروریہ پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

مؤلفہ و مرتبہ

مؤلف تفسیر روح الایمان فی تشریح آیت القرآن و کتاب العطایا و مفتاح خزینۃ المیراث وغیرہ

محمد فتح الدین انصاری افسر ابن حکیم غلام محمد مرحوم خوشاب

سنہ ۱۹۲۴ء ضلع شاہ پور ۱۳۴۲ھ

…دربار الیکٹرک پریس ہال بازار امرتسر میں باہتمام شیخ عبدالکریم پرنٹر طبع ہوا

فہرست مضامین مقدمۂ التفسیر روح الایمان فی تشریح آیات القرآن

المقدمۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ

"الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ"[1]

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ"[2]

دنیا کے لاانتہاء حدودِ زمان اور اُس کے ناپیدا کنار میدان میں صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی بینظیر اور بےمثل کتاب نظر آتی ہے ۔ جس کی پیشانی پر ایک طرف "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" اور دُوسری طرف "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کا نقش آبِ زر سے لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ اس مبارک کتاب کو نازل ہوئے آج تیرہ سَو سال گذرتے ہیں ۔ لیکن اُس کی زبر ۔ زیر ۔ پیش بلکہ ایک نقطہ میں بھی کسی قسم کی کمی بیشی واقعہ نہیں ہوئی ۔ عبارت اور جملوں کی تحریف تو بجائے خود رہی ۔ اس کے الفاظ کی رسم تحریر اور طرز ادائے کلمات میں بھی ایک بال برابر فرق نہیں آیا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جس طرح نازل ہوا ہے ۔ اور جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہی کتاب ہے جس میں شک کو گنجائش نہیں ۔

[2] ہم ہی نے ذکر (قرآن) بھیجا ہے ۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے ۔

کی زبان مبارک سے اس کے الفاظ نکلے ہیں - اور جس رسم تحریر پر آپ صلعم نے اس کی آیتوں کو لکھوایا ہے - اسی رسم تحریر پر بلا کم و کاست بلا تغیر و تبدل سارے کا سارا کلام مجید لکھا ہوا آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے - اور تمام دنیا میں شائع ہو رہا ہے - اور اُسی نبوی طرز ادا کے ساتھ مشرق سے مغرب - شمال سے جنوب تک عرب و عجم کی زبان پر یکساں پڑھا جاتا ہے - آپ اگر مغرب میں ایک شخص سے ایک آیت قرآنی کو سُنیں - اور پھر اقصائے مشرق میں جاکر اسی آیت کو دُوسرے مسلمان سے سماع کریں گے - تو اُس میں سرِ مو فرق نہ پائیں گے ؛

انبیائے سابقہ پر جو کتابیں نازل ہوئی ہیں - اُن میں سے ایک کتاب یا صحیفہ یا ان کے چند ورق یا کم سے کم ایک آیت یا جملہ بھی ایسا نہیں دکھایا جا سکتا - جو اوصافِ مذکورہ میں قرآن شریف کا مُماثل بن سکے - توراۃ - انجیل و زبور کے ماننے والے ہمیشہ سے چلے آتے ہیں - اور اب بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں - اور یہ کتابیں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو کر اُن کے پاس پہونچی ہیں - لیکن کوئی شخص بھی کسی ایک نُسخہ کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا - کہ یہ تمام کتاب یا اُس کا بعض بعینہٖ وہی ہے - جو صاحبِ کتاب پر منجانب اللہ نازل ہوا ہے لیکن اس کے برخلاف کلام مجید کا ایک ایک حرف ایک ایک نقطہ اُسی نزولی آب و تاب کے ساتھ آج تک ویسے ہی فضائے دُنیا پر چمک رہا ہے - جس طرح کہ خداوند عالم کی طرف سے بواسطہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اب سے تیرہ سو سال قبل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا - اور بفضلہٖ ایسے ہی قیامت تک محفوظ و مصئون رہے گا ؎

اَفَلَتْ شُمُوسُ الْاَوَّلِیْنَ وَشَمْسُنَا [۱] - اَبَداً عَلَی الْاُفُقِ الْعُلٰی لَا تَغْرُبُ

حضرتِ سرورِ کائنات عَلَیہِ التحیۃ والتسلیمات کا ارشاد مبارک ہے - "نبیوں میں سے کوئی نبی نہیں ہوا - مگر یہ کہ اس کو آیات الٰہیہ میں سے بعض آیتیں دی گئی ہیں - اور

[۱] گذشتہ اہلِ کمال کے آفتاب غروب ہو چکے ہیں - لیکن ہمارا آفتاب اوجِ رفعت پر ہمیشہ چمکتا رہیگا اور کبھی غروب نہ ہوگا ؛

جو چیز مجھے دی گئی ہے - وہ وحی ہے - کہ اس کو خداوند تعالےٰ نے مجھ پر بھیجا ہے - لہٰذا میں اُمید کرتا ہوں - کہ میں ان تمام نبیوں سے زیادہ پیرو رکھنے والا ہونگا - وہ حدیث یہ ہے :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا قَدْ اُعْطِیَ مِنَ الْاٰیَاتِ - وَاِنَّمَا کَانَ الَّذِیْ اُوْتِیْتُ وَحْیًا اَوْحَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلَیَّ فَارْجُوْا اَنْ اَکُوْنَ اَکْثَرَهُمْ تَابِعًا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ

اس حدیث مبارک کی تخریج امام بخاری نے کی ہے - اور کہا ہے - اس کے یہ معنے ہیں - "تمام نبیوں کے معجزات اُن کے زمانوں کے ختم ہونے کے ساتھ ہی مٹ گئے ، اس واسطے اُن معجزوں کو صرف انہی لوگوں نے دیکھا - جو کہ اس زمانے میں حاضر تھے - اور قرآن مجید کا معجزہ قیامت کے دن تک دائمی ہے - وہ اسلوب بیان اور بلاغت اور غیب کی خبریں بتانے میں خرقِ عادت ہے کوئی زمانہ ایسا نہیں گذریگا - کہ اُس میں کوئی قرآنی پیشین گوئی ظاہر نہو کر اس کے دعوے کی صحت پر دلالت نہ کرے ؛

ایک دُوسرا قول اس حدیث کے معنے میں اس طرح پر ہے - "گذشتہ زمانہ کے نبیوں کے معجزات حسّی اور آنکھوں سے نظر آنے والے تھے - مثلاً صالح علیہ السلام کی اونٹنی حضرت موسےٰ علیہ السلام کا عصا - اور قرآن مجید کا معجزہ عقل و ادراک کے ذریعے سے مشاہدہ میں آتا ہے - اس لئے اس کی تتبّع کرنے والے لوگ بکثرت ہونگے - کیونکہ آنکھوں سے دکھائی دینے والی چیز اپنے دیکھنے والے کے فنا ہوتے ہی خود بھی فنا ہو جاتی ہے - مگر جو چیز عقل کی آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے - وہ باقی رہنے والی شئے ہے - اُس کو ہر ایک شخص یکے بعد دیگرے دائمی طور پر دیکھتا رہیگا "

سابقہ منزلہ کتابیں روایت بالمعنی کی قسم سے تھیں

جاننا چاہیئے کہ - سابقہ کتابیں مثل توراۃ - انجیل و زبور اور دوسرے صحیفے سب کے سب روایت بالمعنے کے قسم سے تھیں (اس کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے) اس لئے وہ تحریف وغیرہ تصرفات انسانی سے محفوظ نہیں رہیں - اور ان کے شارعین کے معجزات حسّی یعنی بداھتہً عقل یا حواس کے ذریعہ سے حاصل

ہو سکنے والے تھے۔ جن کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ یہ دونو باتیں سابقہ شریعتوں کے عدم دوام کی دلیل ہیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اکثر معجزات عقلی ہیں۔ سب سے زیادہ تا بَابَدْ قابل وثوق معجزہ قرآنی ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کی لازوال نعمتوں میں سے ایک جلیل القدر عطیہ ہے۔ بمقابلہ دُوسرے تمام مذاہب کے چونکہ شریعتِ مصطفوی علیہ السّلام ہی قیامت تک صفحۂ ہستی پر باقی رہنے والی شریعت ہے۔ اس واسطے اس کو یہہ خصوصیّت حاصل ہوئی۔ کہ اس کے شارع آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ قائم ودائم اور باقی رہنے والا عقلی معجزہ (قرآن مجید) دیا گیا۔ تاکہ اہل بصیرت ہر زمانہ میں اپنی اپنی بصیرت کے موافق اُسے دیکھ کر اپنی رُوحوں کو نورِ ایمانی سے تازہ ومنوّر کر سکیں ؛

قرآنِ مجید مُعْجِزہ ہے

جاحظ لکھتے ہیں خداوند کریم نے حضرت ختم نبوّت صلے اللہ علیہ وسلم کو ایسے وقت میں پیدا کیا۔ جبکہ عرب کی قوم خطابت اور شاعری کے انتہائے مراتبِ فصاحت وبلاغت میں پہونچی ہوئی تھی۔ اور ان کی زبان محکم ترین السنہ تھی۔ اور وہ الفاظ کا نہایت وسیع اور وافر خزانہ رکھتی تھی۔ ایسی حالت میں جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو اللہ کے ایک ماننے (توحید) اور اپنی رسالت کی تصدیق کی طرف بلایا۔ اور قرآن مجید کی آئتیں اپنی دعوت کی حجّت میں پیش کیں۔ رفعِ خصومت کے لئے انہیں معارضے کی دعوت بھی دی۔ کہ اگر تم قرآن کو کلامِ غیر وحی اور مجھے غیر صادق تصوّر کرتے ہو۔ تو قرآن کی مثل ایک آدھ سُورت بنا لاؤ۔ " فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ " پھر جس قدر آپ صلعم ان سے تحدّی فرماتے۔ اُن کے حوصلے پست ہوتے جاتے۔ جب ان سے کچھ نہ بن پڑی۔ تو کہنے لگے۔ یہ گذشتہ قوموں کے حالات ہیں۔ اور ہم ان سے لاعلم ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تاریخی واقعات نہ سہی۔ من گھڑت باتیں ہی جمع کر لاؤ۔ لیکن اس پر بھی کسی زبان آور کا حوصلہ نہ بڑھا۔ انتہی۔

حاکم نے ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ کہ ایک وقت وَلِید

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قرآن پڑھ سُنایا۔ ولید کا دل نرم ہو گیا۔ ابوجہل کو جب یہ خبر پہونچی۔ تو وہ ولید کے پاس آیا۔ اور کہا۔ اے چچا! قوم چاہتی ہے۔ کہ چندہ کر کے بہت سا مال تمہیں دے۔ کہ تم محمّد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس نہ جاؤ۔ اور اس کا کلام نہ سُنو۔ ولید نے کہا۔ میری قوم خوب جانتی ہے۔ کہ میں ان میں خاصا مالدار ہوں۔ ابوجہل نے کہا۔ تو پھر ان کی بدگمانی رفع کرنے کے لئے قرآن کے بارے میں کچھ ایسا کہو۔ جس سے قوم کو معلوم ہو جائے۔ کہ تم اس کو ناپسند رکھتے ہو۔ ولید نے کہا۔ اللہ جانتا ہے۔ کہ تم لوگوں میں کوئی شخص شعر۔ رجز۔ قصیدہ۔ اور اشعار جن کا جاننے والا مجھ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ مگر واللہ جو بات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے۔ وہ ان میں سے کسی چیز کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی۔ اور واللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے قول میں ایک خاص شیرینی اور لطافت ہے اور جیسے اس کا ظاہر پُر مغز ہے۔ باطن معدنِ حلاوت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کلام بالاتر اور رفیع ہے۔ اس پر کسی کو بلندی حاصل نہ ہوگی۔ اور یہ بھی یقین ہے۔ کہ وہ اپنے سے نیچی چیزوں کو عنقریب پامال کر ڈالے گا۔ اس گفتگو سے ابوجہل دم بخود ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ ان باتوں سے تمہاری قوم تم سے خوش نہیں ہو سکتی اگر اپنے بھائی بندوں کو چاہتے ہو۔ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مذمّت کرو۔ ولید نے کہا۔ اچھا مجھے سوچنے دو۔ پھر کہا۔ یہ تو مؤثر جادُو ہے۔ اور اس میں یہ اثر کسی غیر کی طرف سے آتا ہے ؛

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں ہے۔ جس وقت جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس معجز کتاب کو اہل عرب کی طرف لے کر آئے۔ وہ ایسا وقت تھا۔ کہ اہل عرب فصیحوں کے سرتاج اور آتش زباں مقرّروں کے پیشوا بنے ہوئے تھے۔ قرآن نے اس وقت تحدّی کی۔ ان کو کہا۔ کہ " میرا مثل لاؤ " اور بہت برسوں تک انہیں مُہلت بھی دی۔ مگر فصحائے عرب سے اس کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ جلّ وعلےٰ فرماتا ہے۔ فَلْيَأْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ۔ اس کے بعد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے بفرمان الٰہی ان سے دس سورتوں کے برابر قرآن جیسی کلام پیش کرنے کی تحدّی کی - ان کو کہا -

" اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ -"

اس کے بعد پھر ان سے ایک ہی سورت بنا لانے کی تحدّی فرمائی - بقولہٖ - اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ الخ اور بعد ازاں اپنے قول " اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ الخ میں اسی تحدّی کو کرر بھی فرما دیا - آخر مشرکین فصحائے عرب سے کچھ نہ بن پڑی - اور وہ قرآن کی مثل ایک سورۃ کے بنا لانے سے بھی عاجز رہ گئے - جب ادھر سے کوئی صدا بلند نہ ہوئی - تو با آواز بلند منجانب اللہ کہہ دیا گیا - کہ مشرکین عرب باوجود بلیغوں اور خطیبوں کی کثرت کے قرآن کی مثل لانے سے عاجز ہو گئے ہیں - پس قرآن کا معجزہ پایہ ثبوت کو پہونچ گیا - بقولہٖ

" قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا -"

اگر قرآن مجید کا معارضہ ان کے امکان میں ہوتا - تو وہ قطعاً کر گذرتے - اور قرآن کی تحدّی توڑ کر جھگڑا مٹا دیتے - لیکن کوئی روایت اس بارے میں وارد نہیں ہوئی کہ مشرکین عرب کی جانب سے کسی کے دل میں قرآن کے معارضہ کا خیال تک بھی آیا ہو - یا اس نے اس کا قصد کیا ہو - بلکہ جہاں تک معلوم ہوا ہے - وہ یہ ہے - کہ جب مشرکین کے خطیبوں بلیغوں کی کثرت اور ان کے اجتماع سے بات نہ چل سکی - تو وہ جاہلانہ حرکتوں - دشمنی اور عداوت اور نکمی باتوں پر اتر آئے - کبھی مسلمانوں سے دست بگریبان ہو جاتے - کبھی بیجا ہنسی - مسخری اور بے طور مذاق کرنے لگتے - کبھی قرآن کو جادو کہہ دیا - کبھی سحر و افسانہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا - لیکن اس طرح سے بھی کام نہ چلا - تو تلوار پر راضی ہو گئے - اپنی اور اپنے اقارب کی عزیز جانیں کھوئیں -

عورتوں بچّوں کو مسلمان فاتحین کا جنگی قیدی بنوایا - مال و سامان غنیمت میں دینا گوارا کیا - یہ سب آفتیں کن لوگوں پر آئیں - جو خاندانِ عرب میں بڑے بڑے غیرتمند با حمیت لوگ شمار ہوتے تھے - اگر قرآن کا مثل پیش کر دینا ان کے بس میں ہوتا تو وہ کیوں اتنی ذلتیں سہتے - اور ایک آسان بات کے مقابلہ میں ایسا دشوار امر کیوں گوارا کرتے +

وجہ اعجاز قرآن مجید

قرآن مجید اپنی نظم عبارت - صحت معانی - شستگیٔ الفاظ - حسنِ تشبیہ - رعایتِ سیاق و سباق اور کمالِ فصاحت و بلاغت کے باعث معجز ہے - ابن عطیہ لکھتے ہیں - کمالِ کلام متکلّم کی بلوغ علمی پر موقوف ہوتا ہے - اور کلام مجید ایسے متکلّم کا کلام ہے - جس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے - اور ایسے ہی تمام وجوہ کلام پر بھی - لہٰذا جس وقت کوئی لفظ قرآن مجید کا مرتّب ہوا - اسی وقت اللہ تعالےٰ نے اپنے احاطۂ علمی سے یہ معلوم کر لیا - کہ کونسا لفظ پہلے لفظ کے بعد آنے کی صلاحیت رکھتا ہے - اور ایک معنی کے بعد دوسرے معنی کی تبیین کر سکتا ہے - پھر اسی طرح اوّل قرآن مجید سے آخر تک اس کی ترتیب ہوئی - لہٰذا قرآن مجید کا ایک ایک حرف ایسا تلا ہوا اور پرکھا ہوا ہے - کہ اگر اس میں سے ایک کلمہ کو نکال ڈالیں - اور پھر تمام عرب کی زبان چھانٹ کر اس سے اچھا لفظ لانا چاہیں - تو ہرگز نہ ملیگا - بلکہ اس جیسا لفظ بھی ملنا محال ہے - جو اس موقعہ پر رکھا جا سکے - قرآن کے ذریعے سے عرب کی دنیا پر اس لئے حجّت قائم ہوئی - کہ وہ فصاحت و بلاغت اور خطابت میں بدرجۂ کمال پہنچے ہوئے تھے - اور ان کی طرف سے معارضہ ہونے کا شبہ کیا جا سکتا تھا - اس کی مثال ایسی ہے - جیسے موسےٰ علیہ السلام کا معجزہ ساحروں پر اور عیسےٰ علیہ السلام کا معجزہ طبیبوں پر حجّت ہوا تھا - کیونکہ خداوند تعالےٰ نے مشہور وجہہ پر انبیا علیہم السلام کے معجزات کو ان کے زمانہ کا بدیع ترین امر قرار دیا ہے - موسےٰ علیہ السلام کے عہد میں سحر اور عیسےٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا فن غایت

درجہ اوجِ کمال پر پہونچا ہوا تھا۔ لہذا ان کے معجزات اس طرح مقرر ہوئے۔ جنہوں نے سحر اور طب کو نیچا دکھا دیا۔ ایسے ہی ہمارے ہادیٔ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں فصاحت اور خوش بیانی اعلےٰ پیمانہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس لئے آنجناب علیہ السلام کو وہ معجزہ دیا گیا۔ جس نے فصحائے عرب کی زبان بند کر دی۔ اور ان کے غرورِ خطابت کو توڑ ڈالا۔ انتہی۔

قاضی ابوبکر کہتے ہیں۔ قرآن کی ترتیب اور اس کی نظم کا انوکھا پن اس کے اعجاز کا باعث ہے۔ علامہ فخر رازی لکھتے ہیں۔ قرآن کی وجہ اعجاز اس کی فصاحت اور اس کے اُسلوب بیان کی جدّت ہے؛

علامہ اصفہانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ قرآن نہ فصاحت کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ نہ معانی کے لحاظ سے۔ کیونکہ فصاحت نفس عنصر عربی (الفاظ) کے ساتھ متعلق ہے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ وہی ہیں۔ جو اہل عرب بولا کرتے ہیں۔ اور جن سے وہ اپنی کلام کو ترتیب دیتے ہیں۔ اور اگر معانی کے لحاظ سے کہو۔ تو یہی معانی گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں بھی تھے۔ جس کا قرآن خود معترف ہے۔ "وَاِنَّہٗ لَفِی زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ"۔ اسی طرح اخبار بالغیب کی وجہ سے اعجاز ہونے کا مرجع بھی قرآن کی نظم اور اس کی فصاحت و بلاغت نہیں ہے۔ کیونکہ غیب کی باتیں اگر کیسی ہی بھدّی زبان میں کہی جائیں۔ وہ معجزہ ہیں۔ اس لئے کہ ان کا اعجاز تو صرف اس وجہ سے ہے۔ کہ وہ بلا تعلیم کے حاصل ہوئی ہیں۔ بلکہ قرآن کا اعجاز صرف اس اسلوب بیان کی وجہ سے ہے۔ جو قرآن کے سوائے کہیں نہیں پایا جا سکتا۔ انتہی۔

مطلب یہ ہے۔ کہ اگر قرآن کو اس کی فصاحت و بلاغت۔ اخبار بالغیب اور معانی کے لحاظ سے معجزہ کہا جائے۔ تو اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ قرآن کا اعجاز اضافی ہے۔ یعنے وہ بہ نسبت دوسروں کے بالاتر ہے۔ برخلاف اس کے قرآن اپنے اسلوب بیان میں بالکل نرالا ہے۔ لہذا یہی کہنا انسب ہے۔ کہ قرآن کی وجہ اعجاز اس کا اسلوب بیان ہے۔ جو قرآن کے سوا اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ قاضی عیاض شفا میں

لکھتے ہیں۔ قرآن کسی ایک وجہ سے معجزہ نہیں۔ بلکہ اس کی اعجاز کے مختلف وجوہ ہیں۔

(۱) اس کی حسن تالیف۔ ترتیب کلمات اور بلاغت جو فطرتِ عرب سے کہیں بلند و رفیع ہے؛

(۲) اس کا عجیب و غریب اسلوب بیان جو اس مُلک کے طرزِ بیان سے بالکل جُدا اور انوکھا ہے جس کی نظیر کسی کلام میں نہیں پائی جاتی؛

(۳) وہ اخبار بالغیب کو شامل ہے۔ اور اس کی جملہ پیشگوئیاں سچی ہیں؛

(۴) اس میں علوم کی دقیق اور نازک باتیں اس قدر بیان ہوئی ہیں۔ کہ کسی اور منزلہ کتاب میں اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ اس کا حجم نسبتاً بہت مختصر ہے اتنی کم عبارت میں اسقدر مضامین کا ادا کرنا انسانی فطرت سے بالاتر ہے؛

لَبِیْد بن رُبَیعہ مَلِکُ الشعراءِ جاھلیت (یہ اُن سات شاعروں میں سے ہے جو عرب میں ممتاز تھے۔ جن کے قصائد کعبۃ اللہ میں سنہری حرفوں میں لکھ کر لٹکائے گئے تھے) نے جب قرآن کی چند آئتیں کعبۃ اللہ کی دیوار پر لکھی ہوئی دیکھیں۔ تو کہا "ناممکن ہے۔ کہ یہ کسی انسان کا کلام ہو" اور اسی وقت مُسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد اس شاعری کے جان دادہ نے قرآن میں وہ ذوق پیدا کیا۔ کہ پھر ایک شعر بھی نہ کہا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ قرآن میں ایک برقی تاثیر ہے۔ جس سے روحانی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی آیات پڑھنے سننے سے طبیعت میں ایک ذوقی و وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو زبان سے بیان نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ہے۔ "وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ" الخ۔ کہ جب ایک جماعت آئی۔ اور اس نے ان آئتوں کو سُنا۔ جو نبی پر نازل ہوئی تھیں۔ تو ان لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ اس کی صداقت کے قایل ہو کر ایمان لائے۔

امام غزالیؒ سے کسی نے پوچھا۔ کہ آیتہ "وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا" (قرآن اگر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات تم کو ملتے) سے کیا مراد ہے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ اس سے یہ مراد نہیں۔ کہ اس میں لوگ اختلاف نہیں کریں گے۔ بلکہ کلام مختلف طرح کا ہوتا ہے کبھی اس کے اول اور آخر میں فصاحت کے لحاظ سے اختلاف واقع ہوتا ہے۔ کہ اس کا کچھ حصہ تو

زیادہ فصیح اور کچھ کم فصیح ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ تعلیم کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے۔ کہ وہ کلام کبھی دنیا کی طرف بُلاتا ہے۔ اور کبھی دین کی طرف۔ کبھی وہ مختلف والنّظم ہوتا ہے۔ کہ اس کا کچھ حصّہ موزون ہوتا ہے۔ اور کچھ غیر موزون یعنے غیر مُسَجَّع۔ کبھی کسی حصّہ کا اسلوب بیان خاص قسم کا ہوتا ہے۔ اور دوُسرے کا اس سے مختلف۔ اور قرآن کریم اس قسم کے تمام اختلافات سے منزّہ اور بالاتر ہے۔ وہ شروع سے آخر تک فصاحت و بلاغت میں یکساں ہے۔ اس کا اُسلوب بیان ابتدا سے انتہا تک ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کی تعلیم و غرض بھی سر سے پاؤں تک ایک ہی ہے۔ برخلاف اس کے کلامِ بشر ایسے اختلافات سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے متکلم کے احوال و اغراض آناً فاناً بدلا کرتے ہیں۔ اور اُس کے میلان طبعی میں یکسوئی قایم نہیں رہ سکتی۔ پھر ایسی حالت میں جبکہ کوئی ایک شخص تیئیس ۲۳ سال تک ایک ہی غرض کے مطابق کلام کرے۔ اور اس کے کلام کا ایک ہی انداز ایک ہی اُسلوب ہو۔ اور باوجودیکہ اس پر مختلف احوال طاری ہوتے رہے ہوں۔ پھر بھی اس کے کلام میں اختلاف نہ پایا گیا۔ تو یقیناً یہ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ وہ کلامِ بشر نہیں بلکہ خداوند عالم کا کلام ہے ؛

الغرض کلام مجید کا معجزہ کوئی مخفی چیز نہیں۔ بلکہ دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ جن لوگوں نے مضامین قرآن میں غور کیا ہے۔ خواہ وہ کیسے ہی اسلام کے مخالف کیوں نہ رہے ہوں قرآن کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ذیل میں ہم بعض متعصّب عیسائیوں کی رائے کا خلاصہ لکھتے ہیں۔ جنھوں نے اپنی عمر کا ایک حصّہ اسلام کی نکتہ چینیوں میں صرف کیا ہے۔ لیکن قرآن کی نسبت اس طرح لکھتے ہیں :۔

قرآن شریف کی تعریف عیسائیوں کی زبان سے

پادری راڈویل صاحب لکھتے ہیں "قرآن میں ایک گہری سچائی ہے۔ جو ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح رہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں ؛

مؤرخ گبن صاحب کہتے ہیں۔ "قرآن ایک عام مذہبی۔ تمدّنی۔ ملکی۔ تجارتی۔ دیوانی فوجداری وغیرہ کا ضابطہ ہے۔ وہ ہر ایک امر پر حاوی ہے۔ مذہبی عبادت سے لے کر

رات دن کے کاروبار۔ رُوحانی نجات سے لے کر صحت جسمانی۔ جماعت کے حقوق سے لیکر حقوق افراد۔ اخلاق سے جرائم اور دُنیاوی سزا سے دینی جزا و سزا وغیرہ تک کے تمام احکام قرآن میں موجود ہیں۔ اس میں سیاسی اُصول بھی ہیں۔ جن کی بنا پر حکومت کی بنیاد پڑی۔ اور اُنہیں سے ملکی قوانین اخذ کئے جاتے ہیں۔ اور روزمرّہ کے مقدّمات جانی و مالی کا فیصلہ کیا جاتا ہے "

ڈیون پورٹ صاحب لکھتے ہیں "منجملہ ان بہت سی خوبیوں کے جن پر قرآن فخر کر سکتا ہے اور وہ نہایت ہی عیاں ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ ایک تو مؤدبانہ انداز اور عظمت جس کو قرآن خدا کا ذکر یا اشارہ کرتے ہوئے ہمیشہ مدّنظر رکھتا ہے۔ کہ وہ خدا سے خواہشات رذیلہ اور انسانی جذبات کو منسوب نہیں کرتا۔ اور دوُسری خوبی یہ ہے۔ کہ وہ تمام غیر مہذب و ناشائستہ خیالات حکایات اور بیانات سے بالکل منزّہ ہے۔ جو بد قسمتی سے یہود کے صحائف میں عام ہیں۔ اور یہ کہ قرآن تمام قابل انکار عیوب سے بالکل مبرّا ہے۔ اس پر خفیف سے خفیف حرف گیری بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کو شروع سے آخر تک پڑھ جاؤ۔ مگر تہذیب کے رخساروں پر ذرا بھی چھیپ کے آثار نہیں پائے جائیں گے ؛ انتہٰے۔

نزوُلِ کلامِ مجید

قرآن کی حقیقت کا سمجھنا وحی کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ اور وحی سے جو علوم ادراک حاصل ہوتا ہے۔ وہ بہت کچھ خواب سے مشابہ ہوتا ہے۔ حالانکہ وحی و خواب میں مرتبہ کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے۔ لہٰذا وحی اور خواب کی مختصر کیفیت بیان کر دینے کو ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ تاکہ دونوں میں امتیاز حاصل ہو سکے ؛

حقیقت خواب

حقیقت خواب یہ ہے۔ کہ نفس ناطقۂ انسانی کسی خاص وقت میں واقعات کی تصویر اپنی رُوحانی ذات میں دیکھ لیتا ہے۔ کیونکہ جس وقت نفس روحانیت میں ہوتا ہے۔ تو عام ذوات روحانیہ کی طرح اس میں بھی واقعات کی صورتیں بالفعل موجود ہوتی ہیں۔ رہا یہ امر کہ نفس کو روحانیت کا یہ مرتبہ کب اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ اس مرتبہ کے لئے نفس کا موادِ جسمانیہ و مدارک الیہ

سے مجرّد ہونا شرط ہے۔ اور یہ تجرد سونے کی حالت میں کبھی لمحہ بھر کے لئے اسے حاصل ہوجاتا ہے۔ پس جونہی کہ نفس کو قیدِ جسمانی سے خلاصی ملی۔ اُس نے اپنی مرغوب پیش آنے والی باتوں کو اقتباس کرلیا۔ اور اس اقتباس کے ساتھ مدارک الیہ کی طرف عود و رجوع کیا اسی اقتباس کا نام رویا (خواب) ہے۔ پس اگر یہ اقتباس ضعیفہ ہے۔ اور خیال میں اس کی حکایت و مثال کا طریقہ خلط ملط ہوجانے سے غیر واضح ہے۔ تو اس اُلجھاؤ کی وجہ سے اس کے سمجھنے میں تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر اقتباس قوی ہے۔ اور خیال میں اس کے لئے حکایت و مثال کی ضرورت نہیں ہوئی۔ تو خیال و مثال سے الگ الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے اس میں تعبیر کی حاجت نہیں ہوتی۔ مواد جسمانیہ سے نفس کو تجرّد حاصل ہونے کا سبب یہہ ہے۔ کہ نفس فِیْ حَدِّ ذَاتِھَا بِالْقُوَّہ رُوحانی ہے۔ جسم و مدارک جسمانی سے کمال کا طالب ہے۔ اس لئے جب بدن سے تعلّق محض پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا وجود بالفعل کامل ہوتا ہے۔ تو وہ ایک روحانی مدارک بِالذّات بن جاتا ہے۔ البتہ اس کی روحانیت مرتبۂ اعلےٰ کے اُن ملائک کی روحانیت سے کم درجہ کی ہوتی ہے۔ جن کو کمال پانے کے لئے مدارک بدنی وغیرہ کی حاجت نہیں ہوتی خلاصہ یہہ ہے۔ کہ نفس ناطقۂ انسانی میں فطرتاً یہ استعداد و قابلیّت ہے۔ کہ وہ امورِ غائبہ کا کچھ نہ کچھ اقتباس کرلیتا ہے۔ اور یہ استعداد متفاوت ہوتی ہے۔ بعض میں کم اور بعض میں زیادہ۔ نفوسِ انبیاء میں بھی یہی قوّت و استعداد ہے۔ لیکن بمراتب زیادہ و قوی انبیاء علیہم السّلام خاص خاص اوقات میں عام مرتبۂ بشریت سے بالاتر ہوکر محض ملکیّت اور اعلےٰ مرتبۂ روحانیت پر پہنچتے ہیں۔ اور اُن کی یہ استعداد نزولِ وحی کے وقت بار بار قوۃ سے فعل میں آتی رہتی ہے۔ برخلاف اس کے عام انسانوں میں یہ استعداد بالکل کم اور بہت ضعیف ہوتی ہے۔ یہی تفاوت عام لوگوں اور انبیاء کے خوابوں میں ہے۔ اور اسی درجہ میں انبیاء کے ساتھ غیر لوگ امورِ غیب کے حاصل کرنے میں شریک ہیں۔ اس کے بعد وحی کا درجہ ہے۔ جو اعلےٰ درجہ کے ملائک قدسیہ سے مناسبت پیدا ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس درجہ میں حواس اور قوائے نفسانیہ بالکل

معطّل رہ جاتے ہیں۔ یہ خاصۂ انبیاء علیہم السّلام ہے۔ لیکن چونکہ وہ علم کہ وحی سے حاصل ہوتا ہے۔ مِن وجہ وحی سے مشابہ ہے۔ لہٰذا ارشادِ مبارک ہوا۔ کہ :- اَلرُّؤْیَا[1] جُزْءٌ مِنْ سِتَّۃٍ وَ اَرْبَعِیْنَ جُزْءٍ مِنَ النُّبُوَّۃِ اور دُوسری روایت میں ہے۔ ثلاثۃٍ و اَرْبَعِیْن۔ اور یہ حالت کبھی کبھی خواب کے سوائے بیداری میں بطریق مراقبہ حجاب حواس کے اُٹھ جانے سے بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور نفس ان مطالب کو حاصل کرلیتا ہے۔ جن کی طرف اُس کی توجّہ ہے۔ اس رعایت سے ارشاد مبارک ہوا۔ لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلاَّ الْمُبَشِّرَاتُ۔ یعنے نبوّۃ تو ختم ہوئی۔ فقط مبشّرات باقی ہیں۔ یعنی رویائے صادقہ جو مردِ صالح کو نظر آوے۔ پس رویائے صادقہ وحی نہیں۔ البتہ نبوّت کی ابتدائی

حقیقت وحی

علامت ہیں۔ اور وحی ان علوم الہیّہ کا نام ہے۔ جن کا فیضان نبوّت کے بعد عالمِ قدس سے کمالِ مناسبت پیدا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ الغرض امورِ غیب جو نفوسِ انبیاء پر منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ اُس کے تین طریق ہیں :-

(۱) بواسطۂ رُوح القدس (۲) کبھی مسلسل کلام سُننے میں آتا ہے۔ (۳) کبھی بلا توسّط کلام و بلا توسّط رُوح القدس اِلقائے روحانی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ حدیثوں میں انہی تینوں صُورتوں کا پتہ ملتا ہے۔

(اوّل[۱]) - بلا کسی توسّط کے القائے روحانی ہوتا تھا۔

(دوم[۲]) - جرس کی سی آواز سنائی دیتی تھی - بعد وحی سننے میں آتی تھی۔

(سوم[۳]) فرشتہ آکر کلامِ الٰہی پڑھ سناتا تھا۔

وحی دو قسم ہے۔ ایک یہ کہ وہ معیّن الفاظ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے نبی کے دل پر بواسطہ یا بلا واسطہ القا ہوتی ہے۔ فرشتہ اور نبی کو اس کے الفاظ بدلنے کا اختیار

قرآن وحی متلوّ ہے

نہیں ہوتا۔ پس نبی انہی معیّنہ الفاظ منزّلہ کو یاد رکھتا لوگوں کو سُناتا اور لکھواتا ہے۔ اس قسم کی وحی کو وحیٔ متلوّ کہتے ہیں۔ قرآن مجید اسی قسم کی وحی ہے۔

[1] کہ خواب ۴۳ ویں یا ۴۶ ویں جُزہے نبوّت کے اجزائے سے۔

دوسری[2] قسم وحی کی یہ ہے - کہ ذہن نبی میں معین الفاظ میں وحی کا القا نہیں ہوتا - بلکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک معنیٰ کا القا ہوتا ہے - پھر نبی اسے مناسب الفاظ میں ادا کرتا ہے - ایسے ہی کبھی فرشتہ کے دل میں معنے القا ہوتے ہیں - اور بعد میں وہ انہیں مناسب الفاظ کا لباس پہنا کر نبی کو لا سُناتا ہے - اس قسم کی وحی حدیث ہے - پس وحی قسم اوّل[1] اصل شریعت ہوتی ہے - اور قسم دوم[2] اس کی تشریح اور اس کی متعلقہ ہدایات کی تفصیل ہوتی ہے - لہٰذا قرآن مجید کے متعلق جمہور کا یہ عقیدہ ہے - کہ " قرآن کریم قدیم اور غیر مخلوق ہے "

سُنّت بھی وحی ہے

فاضل جُوینی لکھتے ہیں - قرآن کی قرأت بالمعنے جائز نہیں مانی گئی - اس لئے کہ جبرئیل علیہ السلام نے اس کو بجنسہٖ خداوند تعالےٰ کے الفاظ معینہ میں ادا کیا ہے - اور اس کے ایک حرف میں ذرا بھر بھی تغیر نہیں کیا - اس میں راز یہ ہے - کہ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کے تحت میں اس قدر معانی و برکات کا ذخیرہ ہے - کہ اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا - حضرت جبرئیل علیہ السلام یا کسی اور شخص میں ہرگز یہ قدرت نہیں - کہ قرآن شریف کے ایک حرف کے بجائے اپنی طرف سے اسی انداز کا حرف رکھ سکے - جو معانی و برکات میں اور اسلوب بیان میں قرآن کے اس حرف کا مماثل بن سکے اور وحی کی دوسری[2] قسم میں سنّت کو شمار کیا جاتا ہے - جیسے کہ وارد ہوا ہے - کہ جبرئیل علیہ السلام سنت کو بھی قرآن ہی کی طرح نازل کیا کرتے تھے - لیکن چونکہ اس میں صرف معنی کا نزول ہوتا ہے - اس لئے حدیث شریف کی روایت - روایت بالمعنی جائز سمجھی گئی - کیونکہ جبرئیل علیہ السلام نے اس کو خداوند عالم کے معیّنہ الفاظ میں ادا نہیں کیا - انتہیٰ ؛

اگر قرآن مجید کی قرأت قرأت بالمعنی جائز رکھی جاتی - اور اس کے ان معیّنہ الفاظ منزلہ کو محفوظ نہ رکھا جاتا - جو منجانب اللہ نازل ہوئے ہیں - تو خدانخواستہ اس کا بھی بعینہٖ وہی حال ہوتا - جو پہلی منزّلہ کتابوں زبور - توراۃ و انجیل وغیرہ کا ہوا ہے - کہ وہ روائت و قرأت بالمعنے کے باعث انسانی تصرّفات سے محفوظ نہیں رہ سکیں - اور تبدیل و تحریف کے

ہاتھوں دنیا میں اب اُن کا صرف نام ہی نام باقی ہے اور بس ؛

تاریخ نزول کلام مجید

قال اللہ تعالےٰ - [1] شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ط

وقال - [2] اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ط

وقال - حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ط [3] اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ط

پہلی آیت میں یہ تصریح ہے - کہ قرآن مجید کے نزول کی ابتدا رمضان المبارک کے مہینے سے ہے - اور دُوسری و تیسری آیت انہی معنی کی تائید کرتی ہے - اس لئے کہ لیلۃ القدر کے معنے عام مفسّرین نے وہی بیان کئے ہیں - جو عُرف عام میں بولے جاتے ہیں - یعنی رمضان شریف کے عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ؛ صرف امام فاکہانی ایک شخص ہیں - جو کہتے ہیں - کہ لیلۃ القدر کے یہ عرفی معنے مراد نہیں بلکہ لیلۃ القدر اُس مبارک رات کا نام ہے - جس میں قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی - احادیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے - وہ یہ ہے - کہ قرآن مجید کے نزول کی ابتدا رمضان کی پچیسویں (۲۵) شب سے ہوئی ہے - ہجرت سے تیرہ سال پہلے -

لیکن روایاتِ معتبرہ اس امر کی شاہد ہیں - کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ربیع الاوّل سے ہوئی ہے - امام بیہقی کہتے ہیں - ربیع الاوّل سے رویائے صادقہ کا آغاز ہو گیا تھا - اور یہی بعثت کی ابتدا تھی - یہ حالت چھ مہینہ تک رہی - رمضان سے بیداری میں وحی آنے لگی - اور قرآن اترنا شروع ہوا ؛

مشہور قول یہ ہے - کہ کلام مجید بتمامہٖ رمضان المبارک کی رات الموسوم بہ لیلۃ القدر میں آسمانِ دنیا پر اُتارا گیا - پھر آیت آیت اور سُورۃ سُورۃ ہو کر متفرق طور پر باختلاف

---

[1] وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا ؛

[2] - ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے ؛

[3] - ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا ہے ؛

واقعات ضرورت و مصلحتِ زمانہ کے مطابق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا

آیات و احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ربیع الاوّل ہی بعثت کا زمانہ ہے۔ یعنے نزولِ وحی کی ابتداء ربیع الاوّل سے ہے۔ مگر یہ وحی غیر متلو از قسم سنّت تھی۔ چھ مہینہ تک اسی قسم کی وحی کا نزول ہوتا رہا۔ اور رمضان المبارک سے وحی متلو یعنی قرآن اُترنا شروع ہوا۔

سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ ..... مَالَمْ یَعْلَمْ تک۔

کیفیّتِ نزولِ وحی

امام بخاری ؒ نے ابتدائے نزولِ وحی کی کیفیت کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے اس طرح روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں:۔

پہلے نیند میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو رویائے صادقہ نظر آنے لگے۔ اس کے بعد آپؐ کو تنہائی سے موانست ہوئی۔ اور آپؐ غارِ حرا میں تنہا کئی کئی راتیں رہا کرتے کہ ایک دن حقیقت کا انکشاف ہوا۔ آپ صلعم نے فرمایا۔ کہ میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور کہا۔ پڑھ۔ میں نے کہا۔ کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اُس نے زور سے مجھے دبایا یہاں تک کہ میں بیحال ہوگیا۔ پھر چھوڑ دیا۔ اور کہا۔ پڑھ! تین بار ایسا ہی کیا۔ اور میں برابر عذر کرتا رہا۔ آخر اُس نے "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (مَالَمْ یَعْلَمْ تک پڑھا۔ یعنے اِن آیتوں کو دُہرایا۔" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ اس کے بعد آپؐ خوفزدہ کانپتے ہوئے حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے۔ اور کہا۔ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ (مجھ کو چادر اُڑھاؤ۔ مجھ کو چادر اُڑھاؤ) اس سُورۃ کے نازل ہونے کے بعد سلسلۂ وحی بالکل رُک گیا۔ اور تین سال تک وحی نازل نہ ہوئی۔ (اسے زمانہ فترت کہتے ہیں) تین سال کے بعد پھر وہی فرشتہ نظر آیا۔ آپ صلعم اُس وقت غارِ حرا کے پہاڑ سے اُتر رہے تھے۔ اور فرشتہ آسمان و زمین کے درمیان معلّق بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر رسول کریمؐ

پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اور خوف زدہ ہو کر خدیجہؓ کے پاس آکر کہا۔ مجھے چادر اُڑھاؤ۔ اس کے بعد سورۂ مدثر نازل ہوئی۔ پس سورۂ اِقرأ آغازِ نبوت کی پہلی آیت ہے۔ اور المدثر رسالت کی ابتدائی سُورۃ ہے۔ کیونکہ اس میں قوم کو انذار (آگاہ) کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جو رسالت کا پہلا فرض ہے۔ اس کے بعد ایک ایک دو دو آیتیں ہو کر یا اس سے کم و زیادہ موقع و ضرورت کے مطابق قرآن نازل ہوتا رہا۔

مشہور اور صحیح قول پر نزول کلام مجید کا زمانہ بیس۲۰ برس ہے۔ اور تیئیس۲۳ برس کے متعلق بھی روائیت آئی ہے۔ اس میں تین سال زمانۂ فترت بھی داخل ہے۔ جس میں وحی کا نزول نہیں ہوا۔ اگر یہ شمار نہ کریں۔ تو باقی بیس۲۰ برس زمانۂ نزول وحی متحقق ہوجاتا ہے۔ دس برس مکہ میں اور دس برس مدینہ میں۔

حفاظتِ کلام مجید

قال اللہ تعالےٰ۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ط (بیشک ہم ہی نے الذکر (قرآن) اُتارا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت بھی کریں گے)۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ۔ (ترجمہ۔ قرآن ایک بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ جھوٹ نہ اس کے آگے سے اس کے پاس پھٹکتا ہے اور نہ پیچھے سے) ان آیاتِ بیّنات میں خداوند عالم نے قرآن کی حفاظت کا ذمّہ لیا ہے۔ اور نہایت کھلے اور صاف لفظوں میں اس وعدہ کا اعلان دیا ہے۔ کہ خداوند عالم اس عظیم الشان مقدس کتاب کو ہر قسم کی آمیزش۔ تحریف۔ تغیر و تبدّل نسیان وغیرہ بربادی کے جملہ عیوب و نقائص سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مصئون رکھے گا۔ جو پہلی منزّلہ کتابوں کی تباہی کا موجب ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ اس کتاب و کلام پاک میں کوئی کلمہ۔ لفظ بلکہ حرف و نقطہ بھی ایسا نہیں ڈالا جائیگا۔ جو کلام الٰہی سے نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی حصّہ کلام الٰہی بلکہ ایک حرف یا نقطہ اس میں درج ہونے سے رہ جائیگا یا درج ہونے کے بعد نکالا جاسکیگا۔ بلکہ وہ جیسا کہ نازل ہوا ہے۔ بجنسہٖ بلاکم وکاست

بلاتغیر و تبدل ویسا ہی ہمیشہ کے لئے موجود و محفوظ رہیگا۔ اجلۂ صحابہ کرام۔ تمام محدثین و مفسرین اس بات پر متفق ہیں۔ کہ "الذکر اور کتاب" مندرجۂ آیات بالا سے مراد قرآن کریم ہی ہے۔ اس کے سوائے کوئی اور کتاب یا صحیفہ اس وعدہ الٰہی کے ضمن میں داخل نہیں۔ اور خداوند عالم نے صرف اسی مقدس کتاب (قرآن) کو اپنے وعدۂ حفظ کے مطابق ہر قسم کے تغیرات و نقائصِ تحریف سے محفوظ رکھا ہے اور آئندہ بھی وہ اس کی ایسے ہی حفاظت کرے گا۔

تنقید و تنقیح قرآن کا زمانہ

تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ جو کہ عام اسلامی علوم کے عروج۔ اس کی تنقیح و تنقید کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں جب قرآن مجید کے ایک ایک حرف کی ہر ایک پہلو پر جانچ و پڑتال کی گئی۔ اس کی آیتوں۔ سورتوں اور اس کی ترتیب و تہذیب کو بکمالِ تدبر اور نہایت غور و فکر سے دیکھا بھالا گیا۔ تو محققین زمانہ مثل قتادہ و مجاہد۔ سعید بن جبیر۔ عکرمہ۔ حسن بصری وغیرہم نے صاف لفظوں میں یہ اعتراف کر لیا۔ کہ موجودہ قرآن مجید کا ہر ایک لفظ وحی الٰہی ہے۔ اور وہ ایسے ہی بلا کم و کاست ہم تک پہنچایا گیا ہے۔ جیسے کہ وہ رسول کریمؐ ہبیط وحی علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اور رسولِ امین صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے اس کا اعلان فرمایا۔ اس کی تمام آئتیں اور سورتیں نہایت ہی کامل و مکمل ہیں۔ اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ وہ ہر قسم کے تصرفات مثل تحریف و آمیزش وغیرہ سے پاک صاف ہے۔ (خلاصہ تفسیر ابن جبیر)

حفاظت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

قال اللہ تعالےٰ۔ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۔ ترجمہ۔ اے نبی جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے۔ وہ لوگوں کو پہنچا دو۔ اور اگر تم اس کی تبلیغ نہ کروگے۔ تو (سمجھا جائیگا) گویا تم نے منصبِ رسالت کو پورا ادا نہیں کیا۔ اور اللہ تمہیں لوگوں سے

محفوظ رکھیگا۔

اس آیت میں خداوند عالم نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظتِ جان کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور یہ آیت وعدۂ حفاظت کلام مجید کے لئے مؤکد اور اس کی متمم ہے۔ اس لئے کہ خدانخواستہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی دشمنوں کے ہاتھوں معرضِ خطر میں آجاتی۔ تو پھر سرے ہی سے شیرازۂ نزول کتاب مجید بکھر جاتا۔ اور سلسلۂ کاروبار نبوت درہم برہم خراب و برباد ہو جاتا۔ کتاب ناقص رہ جاتی۔ اور اس کا نازل شدہ حصہ بھی انسانی تصرفات کے باعث مبدل و محرف ہو کر دوسری منزلہ کتابوں کی طرح پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتا۔ اور اس طرح گویا اسلام کا فیصلہ ہی ہو جاتا۔ لیکن خداوند عالم نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ان دو وعدوں (وعدۂ حفاظتِ کتاب۔ حفاظتِ جان) سے نہایت ہی مکمل کر دیا۔ وعدۂ اول کے مطابق کتابِ مبارک کی وہ حفاظت ہوئی کہ اس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اسے نازل ہوئے آج تیرہ سو سال گذرتے ہیں۔ لیکن اس منزلہ کتاب کے زیر و زبر اور نقطہ میں بھی بال برابر فرق نہیں آیا۔ اس کے گنے ہوئے حروف انہیں مخارج سے اسی طریق پر ادا کئے جاتے ہیں۔ جس طریق و انداز پر وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مہبط وحی کے دہن مبارک سے ادا ہوئے ہیں۔ اور اسی طرز کتابت پر لکھے جاتے ہیں۔ جس رسمِ تحریر پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاص اہتمام سے انہیں لکھوایا تھا۔

اور دوسرے وعدہ کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جان مبارک کی حفاظت ایسی کر دکھائی۔ کہ باوجود دشمنوں کی کثرت جماعت۔ پوری آزادی۔ حکومت و قوت کے اور باوجود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس بیکسی۔ یتیمی۔ قلت جمعیت اور کمزوری کے کسی قاتل غاصب سے آپؐ کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا۔ دشمنانِ دین نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں ہزارہا منصوبے باندھے۔ مشورے کئے۔ آپؐ کی حامی جماعت قریش پر بازار کی خرید و فروخت بند کی۔ انہیں تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور رہنے پر مجبور کیا رسول کریمؐ پر قاتلانہ حملے کئے۔ سفر مدینہ میں قاتل سوار پیچھے دوڑائے گئے۔ مدینہ میں بھی کئی تد

آپ صلعم کے قتل کی سازشیں ہوئیں - زہر دیا گیا - مگر سب کے سب ناکام و نامراد ہی رہے اور رسول کریمؐ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی رسالت کے کام کو سرانجام دیا - کتاب اللہ کی دل خواہ اشاعت کی - اسے لکھوایا - پڑھایا - یاد کروایا - اور اپنی رحلت کے وقت اجلّہ صحابہؓ کی ایک کثیر التعداد ایسی جماعت کو چھوڑا - جس نے آپ صلعم کے بعد حق نیابت کو نہایت عمدگی سے ادا کیا ؎

اس وعدۂ الٰہی کی ایفا کا تعلق تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگیٔ مبارک ہی سے تھا - جو بلا کم و کاست پُورا ہوا - اور دُوسرے وعدہ یعنے حفاظتِ کلام مجید کی ایفا کا زمانہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے شروع ہو کر آجتک جس پر تیرہ سو سال گذرتے ہیں - بلا تغیّر و تبدّل و بلا کسی کمی و بیشی کے پُورا ہوا ہے - اور آیندہ بھی ایسے ہی قیامت تک اس کی حفاظت کی اُمید کی جاتی ہے ؎

قرآن شریف کس طرح ضبط ہوا

اب ہم اُن ظاہری اسباب کا ذکر کرتے ہیں - جو اس معجزۂ قرانی یعنے حفظ و ضبط کلام مجید کے لئے قدرتِ الٰہی نے مہیّا کر دئے تھے - حفاظتِ کتاب کا سب سے بڑا اور قوی ذریعہ اس کتاب کی تحریر ہے - اور دُوسرا ذریعہ اس کتاب کا حفظ کر لینا ہے - یعنے یہ کہ کتاب کو ازبر یاد کر لیا جائے - چنانچہ ابتدائے نزول ہی سے اس مبارک کتاب کی حفاظت کے بھی یہی دونو اسباب (تحریر - حفظ) ہی قرار پائے - جس سے سارے کا سارا قرآن کریم آنحضرت رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کی عین حیات آپؐ کے سامنے اور آپؐ کی خاص نگرانی اور زیر حفاظت دونو ظرفوں میں ضبط ہو گیا - یعنے لکھا بھی گیا - اور حفظ بھی ہو گیا ؎

فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹ - دَرَوَی اَحْمَدُ وَاَصْحَابُ السُّنَنِ الثَّلَاثَةِ وَصَحَّحَهُ اِبْنُ حَبَّانِ وَالْحَاكِمُ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ عُثْمَانَ ابْنِ عَفَّان قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يَاتِی عَلَيْهِ الزَّمَانُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ مِنَ السُّوَرِ ذَوَاتِ الْعَدَدِ فَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّیْءُ يَدْعُوْ بَعْضَ مَنْ

يَكْتُبُ عِنْدَهٗ فَيَقُوْلُ ضَعُوْا هٰذَا فِی السُّوْرَةِ الَّتِیْ يَذْكُرُ فِيْهَا كَذَا اھ

(ترجمہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں - کہ پیغمبر خدا علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا دستور مبارک تھا - کہ ایسے اوقات میں جبکہ آپ صلعم پر چند سورتیں ایک ہی وقت میں نازل ہوتی رہتی تھیں - جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ صلعم ان شخصوں میں سے جو قرآن کریم لکھا کرتے تھے - کسی ایک کو بُلا کر اسے فرما دیتے - کہ یہ آیت فلاں سُورت میں جہاں ایسا ایسا ذکر ہے - لکھو -

بخاری باب کاتب النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں بروایت براء لکھتے ہیں -

قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ لَا يَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللهِ الخ - قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُدْعُوْا لِیْ زَيْدًا فَالْيَجِیْءُ بِاللَّوْحِ وَالدَّوَاةِ وَالْكَتِفِ اَوِ الْكَتِفِ وَالدَّوَاةِ ثُمَّ قَالَ اُكْتُبْ لَا يَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ الخ

(ترجمہ) یعنے جب آیت لَا يَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ الخ پ۵ ۹۵ - نازل ہوئی - تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - کہ زید کو میرے پاس بلا لاؤ - اور (کہو) کہ دوات اور لوح اور کتف یا کتف و دوات ساتھ لائے - (جب وہ آگیا) پھر فرمایا - کہ لا یستوی القٰعدون الخ لکھو - بخاری

سُورۂ طٰہٰ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان لانے سے پہلے سورہ طٰہٰ کا لکھا ہوا دیکھنا اور پڑھنا

حضرت ابن ہشام لکھتے ہیں کہ عمر بن خطاب جاہلیّت میں بڑا غضبناک اور پُرجوش طبیعت کا آزاد آدمی تھا - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے برخلاف ہر وقت تُلا رہتا تھا - چاہتا تھا - کہ موقعہ پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ اٹھائے - اسی ارادہ پر ایکدن تلوار لیکر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلا - کہیں سے اُسے معلوم ہو گیا

کہ ان کی ہمشیرہ فاطمہ اور اس کا خاوند سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سنتے ہی عمرؓ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور وہیں سے سیدھا اپنی بہن کی طرف واپس ہوگیا۔ تاکہ پہلے ان کا کام تمام کرے۔ وہاں پہنچا۔ تو اس وقت حضرت خبابؓ فاطمہؓ اور اس کے خاوند سعید بن زید کو سورہ طٰہٰ پڑھا رہے تھے۔ عمرؓ کے پہنچتے ہی جنابؓ ایک طرف مکان کے گوشہ میں چھپ گئے۔ مگر عمرؓ اس کو پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اور ان کا پڑھانا بھی سن چکے تھے۔ اسی لئے وہ پوشیدہ نہ ہو سکے۔ اور حضرت فاطمہ نے اس جلد کو (جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ اور جسے وہ پڑھ رہی تھیں) اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ عمرؓ نے یہ سوال کیا۔ تم کیا پڑھ رہی تھیں؟ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم نے محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا دین قبول کرلیا ہے؟ پھر غصہ میں آکر انہوں نے اپنے بہنوئی سعید کا بازو پکڑ لیا۔ قریب تھا۔ کہ ان کا کام تمام ہو جائے۔ مگر فاطمہ عمرؓ سے لپٹ گئیں۔ اس کشمکش میں فاطمہ کچھ زخمی بھی ہو گئیں۔ آخر کار فاطمہ اور سعید نے کھلم کھلا کہہ دیا۔ کہ بیشک ہم مسلمان ہو چکے ہیں۔ اب تمہاری مرضی جو چاہو۔ ہم سے سلوک کرو۔ اس اسلامی صداقت نے عمرؓ کے دل پر ایسا گہرا اثر کیا۔ کہ یکایک ان کے تمامی جاہلانہ خیالات بدل گئے۔ کہا۔ اچھا مجھے وہ کتاب دکھاؤ۔ جسے تم پڑھ رہی تھیں۔ حضرت فاطمہؓ نے اس وعدہ پر کتاب کا دینا منظور کیا۔ کہ وہ جوں کا توں اسے واپس کر دیں گے۔ اس عہد کے بعد فاطمہ نے کہا۔ اس مبارک کتاب کو نجس آدمی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس کے چھونے کے لئے مشرک شخص کو طہارت کی ضرورت ہے۔ جس پر حضرت عمرؓ نے فاطمہ کی ہدایت کے مطابق غسل کر لیا۔ پھر وہ اس کتاب کو پڑھنے لگے۔ ایک ایک لفظ کو پڑھتے اور فرماتے یہ عجیب کتاب ہے۔ یہ بڑی عزت والی کتاب ہے۔ القصہ حضرت عمرؓ وہیں سے گرویدۂ اسلام ہو کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور مشرف باسلام ہو کر تقویت اسلام کا باعث ہوئے۔"

یہ واقعہ مکہ مکرمہ کا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ تاریخ میں ہے۔ کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں میں چالیسویں شخص ہیں۔ اس وقت ہر طرح پر کفار کا غلبہ تھا

اور وہ مسلمانوں کی ایذا دہی پر ہر وقت تلے رہتے تھے۔ اس واقعہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ابتدائے نزول قرآن ہی سے (علاوہ اس تحریر کے جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاص اہتمام سے لکھوا کر اپنی حفاظت میں رکھ لیتے تھے) عام صحابہؓ کے پاس بھی آیتیں اور سورتیں لکھی ہوئی موجود رہتی تھیں۔ جن کو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنکر یا تو خود لکھ لیتے یا دوسروں سے لکھوا لیتے تھے۔ اور یہ کہ بعض حضرات معلّمی کا کام بھی کرتے تھے۔ جس سے وہ حضرات بھی جو دربار نبوی میں نہیں پہونچ سکتے تھے۔ بخوبی تمام قرآن شریف پڑھ سکتے تھے۔

ایک اور بخاری کی حدیث ہے۔" نُهِينَا أَنْ نُسَافِرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ" کہ سرزمین دشمن میں قرآن لے کر جانے کی ممانعت کی گئی۔ تاکہ دشمن قابو پا کر کتاب اللہ کی بے حرمتی یا اسے ضائع نہ کر سکیں۔ اس کے سوائے اور بھی روایات ہیں۔ جن سے تحریر وحی کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر بخوفِ طوالت ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔ انہیں واقعات پر غور کرنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ کہ ابتدائے زمانۂ نزول قرآن ہی سے قرآن شریف کے لکھے جانے کا عام رواج تھا۔ اور عام صحابہ کے پاس اس کی لکھی ہوئی آیتیں اور سورتیں موجود رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ سرزمین دشمن میں قرآن شریف کے لے جانے کی ممانعت کی ضرورت درپیش آئی۔ ذیل میں ہم ان

کاتبان وحی کے نام

صحابہؓ کی فہرست درج کرتے ہیں۔ جو وحی کی کتابت کا کام کرتے تھے۔

مکہ میں۔ ابوبکر صدیقؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ اور مدینہ میں ان کے علاوہ زبیر بن العوام۔ ابیؓ بن کعب۔ ابیؓ بن فاطمہ۔ حنظلۃ بن ربیع۔ عبداللہ بن ارقم شرجیل بن حسنہ۔ عبداللہ بن رواحہ۔ معاویہ بن ابوسفیان۔ خالد بن سعید۔ ابان بن سعید اور بالخصوص زید بن ثابت تو خدمتِ تحریر قرآن پر معیّن ہی تھے۔ آپ کی عدم موجودگی میں دوسرے صحابہؓ کتابت وحی میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر حضرات بطور خود بھی قرآن لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ابوداؤد لکھتے ہیں۔ معاذ بن جبل۔ ابو درداء۔ ابو ایوب انصاری۔ عبادہ ابن الصامت وغیرہم کے

پاس اکثر قرآن لکھا ہوا موجود تھا - ایسے ہی عبداللہ بن عمر - عبداللہ بن مسعود اُبیؓ بن کعب نے بھی مکمّل قرآن مجید لکھ لیا ہوا تھا - اس زمانہ میں رسول کریمؐ نے احتیاطاً یہ حکم دے رکھا تھا - کہ جو لوگ قرآن لکھا کرتے ہیں - وہ قرآن کے ساتھ میری حدیثیں نہ لکھا کریں -

صحیح مسلم میں ہے - کہ ایکدفعہ رسول کریمؐ نے صحابہؓ سے مخاطب ہوکر فرمایا "لَا تَكْتُبُوْا عَنِّیْ غَيْرَ الْقُرْاٰنِ" کہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو - اس کا ماحصل یہ ہے - کہ چونکہ عام طور پر قرآن کی آئتیں اور سُورتیں لکھی جاتی تھیں - لہٰذا بطریق حفظ ماتقدم یہ ہدایت کی گئی - کہ قرآن مجید کے ساتھ رسول کریمؐ کی اپنی باتیں بھی کہیں صحابہؓ سے خلط ملط نہ ہو جائیں - اگر تحریر وحی کا عام رواج نہ ہوتا - تو اس ہدایت کی ضرورت ہی کیا تھی - اور اختلاط کا خوف ہی کیا ہو سکتا تھا -

اب ہم ایک متعصب عیسائی کی شہادت پیش کرتے ہیں - جس نے مخالفت اسلام میں ایک کتاب (الموسوم بہ لائف آف محمّد) لکھی ہے - چنانچہ وہ اسی کتاب کے صـ۲۸ میں لکھتا ہے - "لیکن اس بات کے ماننے کے لئے بہت زبردست وجوہ موجود ہیں - کہ رسول (کریمؐ) کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن شریف کے نسخے لکھے ہوئے صحابہؓ کے پاس موجود تھے - اور ان نسخوں میں سارا قرآن (کریم) یا قریباً سارا لکھا ہوا موجود تھا اس میں شک نہیں - کہ (حضرت) محمّد (صاحب صلے اللہ علیہ وسلم) کے دعویٰ نبوّت سے بہت پہلے مکّہ میں فنِ تحریر مروّج تھا - اور مدینہ میں جاکر تو خود پیغمبر (علیہ السلام) نے اپنے مراسلات لکھوانے کے لئے کئی صحابی مقرر کئے ہوئے تھے - جو لوگ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تھے - اُنہیں اس شرط پر وعدہ رہائی دیا گیا تھا - کہ وہ بعض مدنی آدمیوں کو لکھنا سکھلائیں - اور اگرچہ اہل مکّہ اہل مدینہ کے برابر تعلیم یافتہ نہ تھے - لیکن وہاں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے - جو اسلام سے پہلے لکھنا جانتے تھے - انتہی

پادری راڈویل جس نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے - آیت لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ط کے حاشیہ میں لکھتا ہے

"اس جملہ سے کم از کم اتنا تو پتہ چلتا ہے - کہ قرآن شریف کی سُورتوں کے لکھے ہوئے نسخے اس وقت عام طور پر زیر استعمال تھے - حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ فرماتی ہیں - کہ جب عمرؓ مُسلمان ہونے لگے - تو انہوں نے مجھے کہا - سورہ طٰہٰ کا نسخہ میرے ہاتھ میں دو - آیات نمبر ۷ - ۸ ، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے - وہ بحکم خلیفہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوالقاسم بن عبداللہ قرآن کریم کی تمام جلدوں پر لکھی جانی شروع ہوئیں - ترجمہ راڈوَل صـ۲۵ -

تحریر کتاب اللہ پر قرآن شریف کی شہادت

سورۂ واقعہ - اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ط

(ترجمہ) یہ (قرآن کریم) بڑی قدر و عزت کا قرآن ہے - ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے - اسے نہیں چھوتے - مگر جو پاک لوگ ہیں -

یہ سورۃ مکّی ہے - اور ابتداً نازل شدہ سورتوں میں سے ہے - لہٰذا اس امر کی کافی شہادت ہے - کہ نزول قرآن کے شروع ہی سے اس کی آئتیں اور سورتیں لکھی جاتی تھیں - کیونکہ مسّ کے لئے کسی ظاہری جسم کا ہونا ضروری ہے -

سورۃ البیّنہ "رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" (ترجمہ) اللہ کا رسول اوراق (قرآن کریم) پڑھ کر سناتا ہے - جس میں مضبوط کتابیں (سُورتیں) ہیں - صُحُف صحیفے کی جمع ہے - (لکھے ہوئے کاغذ) کتب جمع ہے کتاب کی (لکھی ہوئی چیز - لکھا ہوا)

سورۃ عبس - كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ط (ترجمہ) قرآن تو (سراسر) نصیحت ہے - پس جو چاہے - اس سے نصیحت حاصل کرے - اور (وہ قرآن) اوراق میں (لکھا ہوا) ہے - جن کی تعظیم کی جاتی ہے - (اور وہ) اونچی جگہ رکھے ہوئے (رہیں اور) پاک (ہیں) اور وہ ایسے لکھنے والوں یا محافظین یا حاملین کے ہاتھوں میں ہیں - جو بزرگ نیکوکار ہیں -

آیات مذکورہ اس بات کو بوضاحت ظاہر کرتی ہیں - کہ قرآن کریم کی آئتیں اور سورتیں عام طور پر نزول کلام مجید کے ابتدائے زمانہ ہی سے لکھی جاتی تھیں - اور اس کام میں خاص

اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ کہ وہ کس چیز پر لکھی جاتی تھیں ؛

قرآن شریف کی حفاظت کا دُوسرا ذریعہ

یعنے قرآن کریم کا یاد کرنا

قرآن کریم کی نسبت صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ اعتقاد تھا۔ اور جملہ اہل اسلام کا بھی یہی عقیدہ و ایمان ہے۔ کہ اس کا ایک ایک حرف خداوند عالم کی بیشمار رحمتوں کا خزانہ ہے۔ اور اس کے ایک ایک نقطے کے دامن میں لاانتہا برکات بھری ہوئی ہیں۔ یہ وہ متبرّک کلمات ہیں۔ جن کو خداوند عالم نے اپنی لسانِ قدرت سے ادا فرمایا ہے یہ ایک تحفۂ کرامت ہے۔ جس کو رب العزّت نے اپنے حبیب پاک رسول عربی کی طرف ہدیۃً بھیجا ہے۔ اس کی آیات کی تلاوت روح روانِ اسلام اور سماعت تقویت نور ایمان ہے لہٰذا نزول وحی کی طرف ہر وقت صحابہ کرامؓ کی مشتاق آنکھیں لگی رہتی تھیں۔ ہر ایک شخص کے دل میں یہی اُمنگ رہتی تھی۔ کہ تازہ وحی کو سب سے پہلے میں ہی حاصل کروں۔ اسی اشتیاق میں وہ عموماً دربار نبوی میں بکثرت موجود رہتے تھے۔ پس جہاں کوئی آیت نازل ہوئی۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کا اعلان ہوا۔ وہ حضرات اُسے جُوں کا توں اسی وقت یاد کر لیتے تھے۔ ان کے اس شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ دنیوی مشاغل کے باعث جو حضرات عدیم الفرصت تھے۔ انہوں نے ایک دُوسرے سے ملکر باری مقرر کی ہوئی تھی۔ پس ایک شخص حصُولِ معاش میں مشغول ہوتا تو دُوسرا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر رہتا۔ اسی طریق پر باری باری سے اپنا کام بھی کرتے۔ اور اپنی شوقِ تعلیم دین کو بھی پُورا کرتے۔ یعنی جب کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی۔ تو جو حاضر ہوتا۔ اُسے یاد کر لیتا۔ اور عندالملاقات اپنے ساتھی کو اس سے مُطّلع کر دیتا ؛ حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی اکثر نظیریں ملتی ہیں۔ چنانچہ بخاری نے لکھا ہے۔ کہ حضرت عمر فاروقؓ کا ہمسایہ ایک انصاری تھا۔ جس کے

ساتھ اُنہوں نے یہ انتظام کر رکھا تھا۔ کہ باری باری سے ایک شخص حاضر حضورِ اقدس ہوا کرتا۔ اور جو کچھ دیکھتا یا سُنتا۔ اُس سے دوسرے کو عندالملاقات مُطّلع کیا کرتا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ کہ جب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ تو اس دن کی وحی وغیرہ تمام خبریں اپنے دُوسرے ساتھی انصاری کو لاسُناتا۔ اور جس دن وہ حاضر رہتا۔ اُس دن کی تمام خبروں سے وہ مجھے مطلع کرتا۔ اس کے علاوہ صحابۂ کرامؓ کی ایک بہت بڑی جماعت ہمیشہ صفۂ مسجد نبوی میں بطریقِ اعتکاف ہر وقت موجود رہتی تھی۔ جنہوں نے دنیاوی کاروبار ترک کئے ہوئے تھے۔ اُن کا شغل محض تلاوتِ کلام مجید۔ اس کا درس و تدریس اور ذکر و شغل ہی تھا۔ وہ ہر وقت اس بات پر آمادہ رہتے تھے۔ کہ کوئی آیت نازل ہو۔ اور وہ اس کو سب سے پہلے یاد کر لیں ؛

قرآن مجید کے یاد کرنے کیلئے قدُرتِ الٰہی کا انتظام

اس مقدس کتاب کی سہولت حفظ کے لئے قدرتِ الٰہی نے پانچ ذریعے پیدا کر دئے تھے۔

(۱) نمازوں میں قرآن شریف کے پڑھنے کی فرضیّت ؛

(۲) صحابۂ کرام (رضوان اللہ اجمعین) میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک قول و فعل کے اتباع کا شوق ؛

(۳) تعلیم قرآن مجید میں قُرّاء کی قدر دانی ؛

(۴) امامت نماز کے لئے عام قاریوں پر اَقرَاء کی ترجیح۔ اور اس کا تقدّم اور عزّت خاص ؛

(۵) قرآن شریف کا بتدریج (آہستہ۔ آہستہ۔ آیت آیت ہو کر) ۲۱-۲۲ سال کے عرصۂ دراز میں نازل ہونا ؛

مسلمانوں پر چونکہ نماز کا ادا کرنا فرض ہے۔ اور فرض بھی ایسا کہ کسی حالت میں ترک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہر ایک مسلمان پر صرف فرضی نمازوں ہی کے ادا کرنے کے لئے قرآن شریف کا کچھ نہ کچھ حصّہ یاد رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک دن رات میں کم سے کم پانچوقت نماز پڑھی جاتی ہے۔ اور ہر دفعہ کی نماز میں کئی کئی رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور ہر ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ

کے سوائے قرآن شریف کا کچھ اور حصہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر ایک مومن پر مومن رہنے کے لئے بعض حصہ کلام مجید کا یاد رکھنا ضروریات دین سے ہے۔ نماز چونکہ باعثِ تسکین خاطر مومن اور تقرب الٰہی کا اعلےٰ ذریعہ ہے۔ اس لئے صحابہ کرامؓ نہایت خشوع و خضوع اور سچے دل کے لگاؤ سے اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ روایات صحیحہ سے ثابت ہے۔ کہ ان میں کے اکثر حضرات نمازوں میں بہت دیر تک قیام فرماتے تھے۔ یعنے نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ گویا نماز پڑھنے کا حکم بعینہٖ قرآن شریف کے بعض یا کل کے یاد رکھنے کا حکم ہے۔

اسی طرح چونکہ صحابۂ کرام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے جاندادہ اور آپؐ کے ہر ایک قول و فعل پر عمل کرنے کو تقویتِ دین حصول سعادت۔ ترقیٔ مدارج دارین کا باعث یقین کرتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نمازوں میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت احادیث میں ثابت ہے۔ کہ آپ صلعم تہجد کی نمازیں اکثر وقت قرآن شریف کا بہت بڑا حصہ تلاوت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ طول قیام کے باعث کبھی کبھی آپ صلعم کے پاؤں پر آماس آجاتی تھی۔ جس پر بذریعہ وحی ایک معیّن وقت تک عبادت کرنے کی آپ صلعم کو ہدایت ہوئی۔ قال اللہ تعالےٰ:- قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ کہ نصف رات یا اس کے قریب قیام کیا کرو۔

نماز تہجد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عموماً بیس سورتیں تلاوت کرمایا کرتے تھے جن میں سے اٹھارہ کا نام مفصّل ہے۔ جو سورۂ قٓ سے شروع ہوتی ہیں۔ اور دو سورتیں حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ احادیث میں ہے۔ کہ بعض دفعہ آپ صلعم نے ایک ایک ہی رکعت میں آٹھ۔ نو پاروں کے قریب پڑھا ہے۔ اور اس نماز تہجد میں صحابہ کرامؓ کی ایک بہت بڑی جماعت آپ صلعم کے ساتھ شریک رہا کرتی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایسی سورتوں کی ایک خاص تالیف بھی کی ہے۔ جو بعینہٖ اب تک محفوظ چلی آتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ صرف تہجد کی نماز تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ فرضیہ نمازوں میں بھی آپ صلعم نے قرآن شریف کے بڑے بڑے حصص تلاوت فرمائے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وقت کی نماز میں تمام سورۂ نساء اور آل عمران پڑھی ہے۔ یعنے پہلی رکعت میں سورۂ نسا اور دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کی تلاوت فرمائی ہے۔ یہ دونو سورتیں ملکر قرآن مجید کا آٹھواں حصہ ہوتی ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی کا طرز چونکہ یہی تھا۔ کہ وہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک فعل و عمل کو اپنے مسلک کا نمونہ سمجھتے تھے۔ اور اتباع نبوی اور اس کی کمال پیروی میں قدم بقدم چلنے کو ذریعۂ تکمیل ایمان اور باعثِ ہدایت و تقویّتِ اسلام جانتے تھے۔ لہٰذا وہ بھی نمازوں میں دیر تک قیام کیا کرتے تھے۔ تہجد کی نمازوں میں عموماً لمبی لمبی سورتیں تلاوت کرنے میں اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی کی نسبت روایت میں ہے۔ کہ وہ ایک رکعت میں سورۂ بقر پڑھا کرتے تھے۔ اور بہت ساری حدیثیں اس امر کی شہادت دیتی ہیں۔ کہ اکثر وقت صبح کی نماز میں سورۂ بقر پڑھی گئی ہے۔ جو اڑھائی پارے ہے۔ اور یہ عادت عام صحابہ میں جاری تھی چنانچہ بعض وقت طول قیام کی شکائتیں بھی ہوئیں۔ روایت میں ہے۔ کہ ایک دفعہ امامت کے موقعہ پر ایک صحابی نے عشا کی نماز کی ایک رکعت میں سورۂ بقر پڑھی۔ مقتدیوں میں ایک مزدور بھی تھا جو دن بھر کی مزدوری کے باعث تھکا ماندہ تھا۔ اور جلد آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس طولِ قیام کے باعث اسے تکلیف ہوئی جس سے اس نے دربار نبوی علیہ التحیتہ والتسلیم میں امام کے اس طول قیام پر شکایت کی۔

امامت جماعت

قرآن کریم کے یاد کرنے کا ایک ذریعہ عہدۂ امامت جماعت بھی ہے

امام جماعت کے لئے قرآن شریف کا ایک آدھ حصہ یاد رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ

مُبارک عہدہ بہت سی خوبیوں کا جامع ہے - مگر ہم یہاں پر صرف اُنہیں کا بیان کریں گے - جن کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ ہے ؛

امام جماعت کیلئے علم قرأت سے واقف ہونا ضروری ہے - یعنے یہ کہ وہ قرآن فہم اور قرآن دانی کا مادہ رکھتا ہو - اور حروف کو برمحل - مخارج سے ادا کرنے پر قادر ہو - وہ صحابہ کرام جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مکان سے دُور رہنے کے سبب یا مشاغل دنیوی کے باعث لسانِ ترجمانُ الرحمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تازہ وحی کو ہر وقت بلا واسطہ اخذ کرنے میں قاصر تھے - ان کی تعلیم کا یہی ایک طریقہ ہوسکتا تھا - کہ دوسرے صحابہ سے سُن کر آئتیں یا سُورتیں یاد کرلیں - چنانچہ اس قسم کی نقلِ آیات میں سہو - نسیان کا واقعہ ہونا ایک لازمی امر تھا - اور اختلافِ لب ولہجہ کے باعث اصلیّت تلفظِ الفاظ قرآنی بلکہ اصلیّت الفاظ میں بھی فرق آجانا ممکن تھا - اس لئے قدرت الٰہی نے اس نقص کے دفعیہ میں یہ تجویز کی - کہ ہر محلہ کی مسجد میں ایک ایسا شخص رہا کرے - جو قرآن دان ماہر اصلیّت الفاظ اور ہر ایک حرف کو اس کے محل ومخرج سے ادا کرسکنے والا عالم مسائلِ فقہ ہو - جو مغرب - عشا اور صبح کی نمازوں میں جماعت کے سامنے علاوہ سورۃ فاتحہ کے قرآن کریم کے بعض بعض حصوں کو بآواز بلند پڑھا کرے - اور قرأت بھی جھکڑ کی طرح نہ ہو - بلکہ ترتیل کے ساتھ آہستہ آہستہ تاکہ ہر ایک حرف برمحل اور اپنے مخرج سے اس طرح ادا ہو - کہ سُننے والا ان میں تمیز کرسکے - اور مقتدی خاموش ہمہ تن گوش ہو کر اُسے سنا کریں - اس تجویز سے مقتدیوں کی سہو ونسیانِ وحی اور ان کی غلطیوں کا صرف ازالہ ہی نہیں ہوا کرتا تھا - بلکہ ان کے ایمانوں میں ہر روز ایک تازہ روحانی رُوح پھونکی جاتی تھی - اور صبح کا سہانا وقت اور ادھر لہجہ عرب میں ایک سُریلی آواز کے ساتھ مقدّس وپُراثر کلامِ خدا کی قرأت اور سُننے والے بھی کون ؟ زبانِ عرب کے ماہر فصُحَاَءَ ، بُلَغَاء - شاعر و نثار وخطیب پھر کیا تھا - دل اُچھل اچھل کر سینوں میں تنگ کردیتے تھے - خون جگر رقیق ہو ہو کہ آنکھوں کی راہ سے اُبل پڑتا تھا - اللہ تعالےٰ نے صحابہ کرامؓ کی اس حالتِ محویت اور ان کے اس اسلامی جوش کی تعریف میں فرمایا ہے - [1] اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ

[1] جب انہیں اللہ کا ذکر سنایا جاتا ہے - تو اُن کے دل کانپ اُٹھتے ہیں ؛

اٰیَاتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَاناً (انفال)

وقال [2] - اِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (مائدہ)

یہی باعث تھا - کہ ایک ایک رکعت میں سورۂ بقر جیسی لمبی لمبی سورتیں ترتیل کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں - مگر مقتدیوں کے مُشتاق دل ابھی سیر نہ ہوتے تھے - اور کیوں سیر ہوتے - وہ ہمہ تن نورٌ علےٰ نُور تھے - آیات قرآنی کی تلاوت ان کی روح رواں تھی - اور ان کے ایمانوں کی صفائی میں مصقلہ کا کام دیتی تھی - ادھر تکبیر تحریمہ کی آواز بلند ہوئی - اور اللہ اکبر کا نعرہ اُن کے کانوں میں پہنچا - اور ادھر حجابِ فیما بین کافور ہوئے -

الغرض مسجد کا پیش امام اہل محلّہ کے لئے قرآن شریف کا معلّم ہوتا تھا - جس سے ان کے بچے عورتیں وغیرہ سب کے سب آسانی کے ساتھ قرآن مجید سیکھ سکتے تھے ؛

امامت جماعت کے فوائد امامت کہ دراصل منصبِ نیابت خلیفۃ اللّٰہ ہے - اس لئے جو شخص امام کے نام سے موسوم ہوتا تھا - عام لوگوں کے دلوں پر اس کی عظمت ووقعت کا سکہ فوراً بیٹھ جاتا تھا - اور وہ ایک رُوحانی حاکم تسلیم کرلیا جاتا تھا - دربار نبوی علیہ التحیۃ والتسلیم میں اس کی خاص عزت کی جاتی تھی - اس لئے اس مُبارک عہدہ کے حاصل کرنے میں عموماً صحابہ کرامؓ کی توجہ مبذول رہتی تھی - جس سے علم قرأت کے حاصل کرنے میں وہ ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے - یہاں تک کہ تمام صحابہؓ میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا - جو جماعت کو نماز نہ پڑھا سکے - لہٰذا امام جماعت کے لئے بجائے قاری ہونے کے اُقرأ کی قید بڑھانے کی ضرورت در پیش آئی - اور رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہوا - کہ "یَؤُمُّکُمْ اَقْرَءُکُمْ" - کہ امامت کے لئے وہ شخص منتخب ہو - جو دُوسرے عام موجودہ قاریوں میں زیادہ تر قاری ہو - یہ تاکید کیا تھی - گویا اشتیاق حفظ وترتیل قرآن کے لئے ایک کوڑا تھی - جس سے صحابہ کرامؓ اور بھی چمک اُٹھے - جس شخص کی قرآن خوانی

[2] جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں - جو رسولؐ پر نازل ہوا ہے - تو اس کی حقیت کو دیکھ کر دکثرت ذوق سے) اُن کی آنکھیں خون اُبلنے لگ جاتی ہیں ؛

رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے - اُس کا مکان مجمع حُفّاظ وقرأت خواناں بنا رہتا تھا یہ وہ مبارک پُراثر ارشاد تھا - جس نے آناً فاناً صحابہؓ کے دلوں میں قرآن شریف کے سننے اور اس کے یاد کرنے کا اور قرآن دانی میں کمال پیدا کرنے کا غیر معمولی جوش پیدا کر دیا تھا - گھر میں ہوتے یا جنگل میں کچھ نہ کچھ غنغنانے کی آواز ان کے منہ سے نکلتی سنائی دیتی تھی - اور یہ خاصہ صرف مردوں ہی کا نہ تھا - بلکہ مستورات میں بھی قرأت قرآن کا جوش ویسے ہی لہریں مارتا ہوا نظر آتا تھا - روایات معتبرہ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ - حضرت حفصہؓ - حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہن کی قرآن دانی کے متعلق اکثر شہادتیں موجود ہیں ؎ یہ بھی ثابت ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے قرآن شریف سُنا بھی کرتے تھے - حفظ قرآن اور اس کی ترتیل کے لئے اس تحریک سے جو کچھ اثر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے - ہر شخص میں ہر وقت یہ اُمنگ رہتی تھی - کہ میری قرأت اس قابل بن جائے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود سماعت فرما کر اسے پسند فرمائیں - اور اس کوشش کو وہ اپنے ایمانوں کی تکمیل سمجھتے تھے -

عَنْ عَبْدُ اللهِ - قَالَ - قَالَ لِی نَبِیُّ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِقْرَءْ عَلَیَّ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللهِ اَاَقْرَءُ عَلَیْکَ وَ عَلَیْکَ اُنْزِلَ قَالَ نَعَمْ فَقَرَأْتُ سُوْرَةَ النِّسَآءِ حَتّٰی اَتَیْتُ عَلٰی هٰذِهِ الْاٰیَةِ "اِذَا جِئْنَا بِکَ عَلٰی هٰؤُلَآءِ شَهِیْدًا" قَالَ حَسْبُکَ اَلْاٰنَ - فَاِذَا عَیْنَاهُ تَذْرِفَانِ ؎

ترجمہ - عبد اللہ سے روایت ہے - کہا - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک دفعہ فرمایا - کہ مجھے قرآن سناؤ - میںنے عرض کیا - کہ حضور! کیا میں آپؐ کو سُناؤں؟ اور آپؐ پر تو نازل ہوا ہے - اس پر آپ صلعم نے فرمایا - کہ ہاں! اور (دُوسری روایت میں ہے - کہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے - کہ دُوسروں کو پڑھتا ہوا سنوں) یہ سُنکر میں نے سورہ نساء پڑھنی شروع کی - یہاں تک کہ جب میں اس آیۃ پر پہنچا "فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا" الخ - تو ارشاد ہوا - اس وقت بس کر - میں نے دیکھا - تو آپ صلعم کی آنکھوں سے آنسو چل رہے تھے ؎

ایسے ہی باب نسیان میں بخاری لکھتے ہیں - کہ ایک دفعہ رات کے وقت ایک شخص نماز

میں قرآن پڑھ رہا تھا - تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُسے سنتے رہے - ایک روایت میں ہے کہ جب کسی صحابی کے مکان میں سے قرآن شریف کے پڑھنے کی آواز آپ صلعم سماعت فرماتے - تو اُسے سُنا کرتے ؎

تعلیم قرآن اور اُس کا حفظ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خود بذاتِ مبارک کلامِ الٰہی کی تلاوت اس کے حفظ اور اس کی اشاعت کے جاندادہ تھے - اسی طرح اس کی تعلیم کے عام کرنے اور اس کے رواج دینے میں بھی از حد شایق اور حریص تھے - آپ صلعم کا یہ دستور مبارک تھا - کہ قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے اور اُس کے یاد کرنے کے متعلق اکثر تاکید فرماتے - اور صحابہؓ میں اس کی رغبت وشوق کے بڑھانے کی عموماً کوشش کیا کرتے تھے - چند روایات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں - جن سے ثابت ہوتا ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں قرآن کریم کی عام تعلیم ہوا کرتی تھی - اور اس تعلیم و تعلّم کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص توجہ مبذول رہتی تھی ؎

صحیح مسلم میں ہے - عَنْ عُقْبَةَ ابْنِ عَامِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِی الصُّفَّةِ فَقَالَ اَیُّکُمْ یُحِبُّ اَنْ یَغْدُوَ کُلَّ یَوْمٍ اِلَی الْبُطْحَانِ اَوِ الْعَقِیْقِ فَیَأْتِیَ بِنَاقَتَیْنِ کَوْمَاوَیْنِ فِیْ غَیْرِ اِثْمٍ وَلَا قَطْعِ رَحْمٍ - قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللهِ کُلُّنَا نُحِبُّ ذٰلِکَ قَالَ اَفَلَا یَغْدُوْ اَحَدُکُمْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَیَعْلَمُ اَوْ یَقْرَءُ اٰیَتَیْنِ مِنْ کِتَابِ اللهِ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ نَاقَتَیْنِ وَثَلٰثٌ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ ثَلٰثٍ وَاَرْبَعٌ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَرْبَعٍ وَمِنْ اَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْاِبِلِ (رواہ مسلم)

(ترجمہ) عقبہ بن عامر سے روایت ہے - کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے - اور ہم اس وقت صفۂ مسجد میں تھے - ارشاد ہوا - کہ تم میں سے کون شخص یہ چاہتا ہے - کہ ہر روز بطحان یا عقیق پر جائے - اور بڑی کوہان والی دو اونٹنیاں بغیر کسی کو تکلیف پہنچائے بغیر گناہ کئے اور قطع رحم کئے کے لائے - ہم نے عرض کیا - یا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم ہم سب اس بات کو پسند کرتے ہیں ۔ پھر ارشاد ہوا ۔ کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ۔ کہ صبح کے وقت مسجد میں آکر کتاب اللہ کی دو آیتیں پڑھائے یا پڑھے جو اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہیں ۔ اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے بڑھ کر ہیں ۔ (اسیطرح) جسقدر آیتیں پڑھے گا ۔ وہ اُتنی ہی اونٹنیوں سے بہتر ہوں گی ؎

بخاری میں ہے ۔ عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ۔ قَالَ ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ ط

(ترجمہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ۔ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سب سے بہتر وہی شخص ہے جو قرآن کو سیکھتا اور سکھاتا ہے

بخاری و مسلم میں ہے ۔ عَنْ عَائِشَةَ اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ سَفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِيْ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ يَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ شَاقٌّ عَلَيْهِ فَلَهٗ اَجْرَانِ ۔

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ۔ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قرآن کے ماہر اُن فرشتوں کے ساتھ ہوتے ہیں ۔ جو بڑی عزّت والے اور بزرگ ہیں اور جو شخص قرآن کریم کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے ۔ اور نہایت مشکل سے اس کے حروف کو ادا کرتا ہے ۔ اس کے لئے دو چند اجر ہے ؎

اگر غور سے دیکھا جائے ۔ تو ہمارے دعوے کے ثبوت میں یہی ایک ہی حدیث کافی ہے کیونکہ کلام اللہ شریف کی اہمیت تعلیم کا اس سے پورا پورا اندازہ ہوسکتا ہے ۔ کہ اس شخص کو بھی جس کی زبان پر قرآن شریف کے الفاظ مشکل سے چڑھتے ہیں ۔ (باوجود عذر مقبول اور تکلیف مسموع کے) قرآن شریف کے پڑھنے ہی کی طرف ترغیب دی گئی ہے ؎

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا عَلَى اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْمَالَ فَهُوَ يُنْفِقُ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ ۔

(ترجمہ) ابن عمر سے روایت ہے ۔ کہا ۔ کہ فرمایا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کہ رشک دو آدمیوں کے ساتھ کرنا جائز ہے ۔ ایک تو اس شخص کے ساتھ کہ جسے اللہ نے قرآن پڑھایا ۔ اور وہ دن رات اس کی تلاوت میں مشغول رہتا ہے ۔ اور اس پر عمل کرتا ہے ۔ دُوسرا اس شخص کے ساتھ کہ خدا نے اُسے مال دیا ۔ اور وہ دن رات اُسے خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے ۔

عَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ الَّذِيْ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ كَالْاُتْرُجَّةِ طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَرِيْحُهَا طَيِّبٌ وَالْمُؤْمِنُ الَّذِيْ لَا يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ كَالتَّمْرَةِ طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَلَا رِيْحَ لَهَا

ابو موسےٰ اشعری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں ۔ کہ فرمایا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مومن قرآن پڑھتا ہے ۔ اس کی مثال نارنگی کی طرح ہے ۔ کہ اس کا ذائقہ بھی اچھا ہے ۔ اور خوشبو بھی عمدہ ہے ۔ اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا ۔ اس کی حالت کھجور کے مشابہ ہے ۔ جس کا ذائقہ تو اچھا ہے ۔ مگر خوشبو نہیں ؎

مذکورہ بالا حدیثوں سے صاف اس بات کا پتہ چلتا ہے ۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کی تعلیم کے عام کرنے میں از حد کوشش فرمایا کرتے تھے ۔ اس جگہ ہم نے نمونہ کے طور پر چند احادیث کا ذکر کر دیا ہے ۔ ورنہ صحاح میں اس مضمون کی حدیثیں کثرت سے پائی جاتی ہیں ۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں استذکار و تعاہد قرآن پر ایک باب باندھا ہے ۔ جس میں اس قسم کی حدیثیں جمع کی ہیں ۔ جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوتِ قرآن مجید پر مداومت کرنے کی ہدایت فرمائی ہے ۔ دُوسرا باب بعنوان تَعْلِيْمُ الصِّبْيَانِ الْقُرْاٰنَ قایم کیا ہے جس میں اولاد کو قرآن شریف کی تعلیم دینے کے احکام ہیں ۔ تیسرا خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ کے عنوان پر لکھا ہے ۔ چوتھا بعنوان اَلْقِرَاءَةُ عَنْ ظَهْرِ الْقَلْبِ ہے ۔ جس میں قرآن شریف کے زبانی یاد کرنے کے احکام اور اس کے ثواب و مدارج کا بیان ہے ؎

الغرض کتب صحاح میں قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے اور اس کے یاد کرنے کے متعلق اس قدر حدیثوں کا ذخیرہ ہے ۔ کہ اس مضمون پر مستقل ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے ؎

پادری ولیم کا قول حفظ کلام مجید کے متعلق

پادری ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دیباچہ صفحہ ۱۶ میں صحابہ کرامؓ کے اشتیاق حفظ کلام مجید (قرآن شریف) کے متعلق لکھتا ہے:۔

"عرب کے لوگ نظم کے بہت سرگرم اور جاندادہ مشتاق تھے۔ لیکن اُن کے پاس ایسے اسباب موجود نہ تھے۔ کہ جن سے وہ اپنے شاعروں کے کلام کو ضبطِ تحریر میں لا سکتے۔ اس لئے بہت مدت تک ان میں یہی رواج رہا۔ کہ اپنے شعراء کی کلام اور اپنی قوم اپنے آباؤ اجداد کے تاریخی حالات کو دل کی زندہ الواح پر ہی بہت عمدگی اور صحت کے ساتھ طبع کر لیتے۔ اس طرز سے ان میں قوتِ حافظہ کمال درجہ ترقی پر پہنچ گئی ہوئی تھی۔ اور یہی قوت اس نئی پیدا شدہ رُوح کے ساتھ پُورے اخلاص اور شوق سے قرآن کریم کے حفظ کرنے میں کام آئی۔ انتہی"

ہم اس بات کو ظاہر کر چکے ہیں۔ اور کافی طور پر اس کا ثبوت بھی دے آئے ہیں کہ صحابہ کرامؓ قرآن کریم کے حفظ کرنے اور اس کی تلاوت میں لگے رہنے کو اپنا منصبی فرض ایمان سمجھتے تھے۔ اور ہمہ تن خلوص و عقیدت کے ساتھ اس کام کے سرانجام دینے میں کوشاں رہتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ ان کا یہ سارا جوش و خروش نِری عقیدت ہی عقیدت پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ فیوضاتِ صحبتِ نبوی علیہ التحیۃ والتسلیم و اِنعکاسِ انوارِ صدرِ مبارک مصطفوی علیہ الصّلوٰۃ و السلام نے حضرات صحابہؓ کے دلوں پر اپنا خاص رنگ جما دیا ہوا تھا۔ جس سے خود بخود ان کی طبعیتیں عالم قدس کی طرف مائل اور رُوحانیات سے اُنس پذیر ہو گئی تھیں۔ آیاتِ کلام مجید کے پڑھنے سُننے سے اُن کی رُوحوں میں تازہ جان آجاتی تھی۔ اور وہ اُن کی ایک رُوحانی غذا تھی۔ ذکر و اذکار سے ان کے دل بے خود ہو کر بھڑک اُٹھتے تھے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں اُونٹوں کے چرواہوں اور بکریوں کے گڈریوں کے لئے آیات قرآنی کی تلاوت ہی دل کا بہلاؤ بنی رہتی تھی۔ ندوؤں اور عام جلسوں میں بھی قومی مفاجر کے گیتوں کے بجائے قرآنی سُورتیں ہی عرب کی

سُریلی آوازوں میں سنائی دیتی تھیں۔ ان کے اشتیاق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ بعض صحابی ہر رات میں سارے کا سارا کلام مجید ختم کر لیا کرتے تھے۔ ترمذی میں ہے۔ وَرُوِیَ عَنْ عُثْمَانَ ابن عفّان اِنَّهٗ کَانَ یَقْرَءُ الْقُرْاٰن فِیْ رَکْعَةٍ یُوْتِرُبِهَا۔ یعنے حضرت عثمانؓ سے روایت ہے۔ کہ وہ ایک رکعت میں سارا قرآن شریف ختم کیا کرتے تھے۔ دوسری روایت سعید بن جبیر سے ہے۔ کہ عثمان بن عفان نے دو رکعت میں حرم کعبۃ اللہ میں قرآن ختم کیا ہے۔

ترمذی۔ وَرُوِیَ عن سعید بن جبیر اِنَّهٗ قَرَءَ الْقُرْاٰن فِیْ رَکْعَتَیْنِ فِی الْکَعْبَةِ

یہاں تک کہ اس روز افزوں ترقئ تلاوت اور اس طریق پر ختم شبینہ کے رواج عام کو دیکھ کر رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کو ختم قرآن کے متعلق ایک ایسے طریق کے اختیار کرنے کی ہدایت کرنی پڑی۔ جو طبع انسانی پر گراں نہ ہو۔ اور اس دنیوی مشاغل میں بھی ہرج واقع نہ ہو۔ چنانچہ صحیح بخاری میں اس مضمون پر ایک باب ہے۔ کہ قرآن شریف کتنی مدت میں ختم کرنا چاہیئے۔

ایک حدیث میں ہے۔ کہ ایک صحابی ایک رات میں سارا کلام مجید ختم کیا کرتے تھے۔ رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوایا۔ اور ہدایت فرمائی۔ کہ قرآن مجید کے پڑھنے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ ایک رات میں نہیں۔ بلکہ سات پانچ یا کم از کم تین دن میں ختم کرنا مناسب ہے۔

ایک اور حدیث ترمذی و مسند دارمی وغیرہ میں ہے۔ عَنْ عَبْدُ اللّٰه بن عمر قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰه فِیْکَمْ اَخْتِمُ الْقُرْاٰنَ قَالَ اَخْتِمْهُ فِیْ شَهْرٍ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ اَخْتِمْهُ فِیْ عِشْرِیْنَ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ اَخْتِمْهُ فِیْ خَمْسَ عَشْرَةَ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ اَخْتِمْهُ فِیْ عَشْرٍ قُلْت اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ اختمه فی خَمْسٍ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ فَمَا رَخَّصَ لِیْ ؕ

(ترجمہ) عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

عرض کیا - یا رسول اللہؐ میں کتنے عرصہ میں قرآن مجید ختم کیا کروں - فرمایا ایک ماہ میں - اس نے عرض کیا - میں اس سے جلدی میں ختم کر سکتا ہوں - فرمایا - پچیس۲۵ دنوں میں ختم کیا کرو - اس نے عرض کیا - میں اس سے جلدی میں ختم کر سکتا ہوں - فرمایا - بیس۲۰ دنوں میں ختم کیا کرو - اس نے عرض کیا - میں اس سے جلدی میں ختم کر سکتا ہوں - فرمایا - پندرہ۱۵ دنوں میں ختم کرو - اس نے عرض کیا - میں اس سے جلدی میں ختم کر سکتا ہوں - فرمایا - دس۱۰ دنوں میں ختم کرو - اس نے عرض کیا - میں اس سے جلدی میں ختم کر سکتا ہوں - فرمایا - پانچ دنوں میں ختم کرو - اس نے عرض کیا - میں اس سے جلدی میں ختم کر سکتا ہوں - تو پھر فرمایا - بس - یعنے اب اس سے کم مدّت ختم قرآن کی میعاد نہیں ہو سکتی ؎

ایسے ہی فتح الباری شرحِ صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۵۳ میں ہے - عن ابن مسعود اقرؤا القرآن فِي سَبْعٍ وَلَا تَقْرَءُوهُ فِي أَقَلِّ مِنْ ثَلَاثٍ کہ قرآن کریم سات دنوں میں پڑھا کرو - یعنے ختم کیا کرو - اور تین دن سے کم مدت میں ختم نہ کرنا چاہیئے ؎

اسی کتاب میں ایک اور حدیث ہے - عن عائشہ رضی اللہ عنہا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَخْتِمُ الْقُرْآنَ فِي أَقَلِّ مِنْ ثَلَاثٍ ؎

یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں - کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کو تین دنوں سے کم عرصہ میں ختم نہیں کیا کرتے تھے ؎

الغرض صحاح میں بہت ساری حدیثیں اس قسم کی پائی جاتی ہیں - جن سے ثابت ہوتا ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حافظانِ کلام مجید کی جماعت کافی تعداد میں موجود ہو گئی تھی - جن میں سے اکثر حضرات ایک رات میں سارا کلام مجید نوک زبان سُنا سکتے تھے - اور حُفّاظ کی ایک ایسی جماعت بھی تھی - جو قُرّاء کے نام سے موسوم تھی - یعنے قرآن مجید کی تعلیم دینے والے حُفّاظ صاحب فتح الباری لفظ قُرّاء کی تشریح میں لکھتے ہیں - "اَلَّذِيْنَ اشْتَهَرُوْا بِحِفْظِ الْقُرْآنِ وَالتَّصَدِّيْ لِتَعْلِيْمِهِ" - یعنے قُرّاء وہ لوگ ہیں - جو قرآن شریف کے حفظ کرنے اور دوسروں کو قرآن شریف سکھلانے کے لئے مشہور تھے"

قرآن شریف کی عام تعلیم اور اس کی روز افزوں ترقی اس کے حفظ کے رواج عام کے ساتھ ساتھ سہو و نسیان کے باعث غلط الفاظ کا زبان پر آجانا اور مخارج حروف میں تساہل و غفلت کے باعث اصلیت حروف میں تغیر کا پیدا ہو جانا چونکہ ایک لازمی امر تھا - لہٰذا اس نقص کے دُور کرنے کے لئے برعایت حفظِ ماتقدم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پانچ اقراء صحابی مقرر فرما دیئے تھے - ان حضرات کا یہ کام تھا - کہ دُوسرے صحابہؓ سے اُن کی یاد کی ہوئی سُورتیں سُنا کرتے تھے - گویا عام حافظانِ کلام مجید و قاریانِ قرآن شریف کی صحّتِ حفظ کے مدار علیہ بنا دیئے گئے تھے - وہ حضرات یہ ہیں :-

قرآن پڑھانیوالے قاریوں کے نام

عبداللہؓ بن عمر - عبداللہؓ بن مسعود - سالمؓ - معاذؓ - اُبیؓ بن کعب - مکہ مکرّمہ میں ارقم مخزومی کا مکان درسگاہِ قرآن مجید معیّن تھا - جہاں عام مسلمان جمع ہوتے - اور قرآن خوانی کرتے تھے - اور ہجرت کے بعد اہل صفہ (جس میں کم و بیش اسّی آدمی تھے) - کی خصوص یہی خدمت معین ہوئی - کہ خود بھی قرآن پڑھیں - اور دُوسروں کو بھی پڑھائیں ؎

امام بخاریؒ نے "باب القراءؓ من اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم میں حافظانِ کلام مجید کے متعلق بہت سی حدیثیں بیان فرمائی ہیں - از انجملہ ایک یہ ہے -

ذَكَرَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ لَا اَزَالُ اُحِبُّهُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خُذُوا الْقُرْآنَ مِنْ اَرْبَعَةٍ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَسَالِمٍ وَمُعَاذٍ وَ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ - یعنے عبداللہ بن عمر نے عبداللہ بن مسعود کا ذکر کرتے ہوئے کہا - کہ میں ہمیشہ اس سے محبّت کرتا رہونگا - کیونکہ مینے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سُنا ہے - کہ چار آدمیوں عبداللہؓ بن مسعود - سالمؓ - معاذؓ اُبیؓ بن کعب سے قرآن سیکھا کرو ؎

اس حدیث مبارک سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے - کہ تمام صحابہؓ کرام میں صرف یہی چار صحابی حافظ قرآن تھے - اور قرآن شریف کی تعلیم انہیں میں محدود تھی - بلکہ اس حدیث سے ان حضرات کی قرآن دانی کا اظہار مطلوب ہے - یہ وہ حضرات ہیں - جنہوں نے رسول کریم صلّی اللہ

علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن اخذ کیا - اور دربار نبوی ہی میں اُسے یاد کیا - اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حفظ کی صحت فرمائی تھی - خصوصاً عبد اللہ بن مسعود کی قرأت آپ صلعم کو بہت پسند تھی - چنانچہ مرضِ وصال میں آپؐ کی تسکین خاطر کے لیئے یہی علاج قرار پایا تھا - کہ عبد اللہ بن مسعود قرآن پڑھ کر سُناتے - یہاں تک کہ تقریباً انہوں نے سارا کلام مجید آپ صلعم کو سُنایا؛

احادیث معتبرہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے - کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں حفّاظ و قُرّاء بکثرت موجود تھے - ہم ذیل میں چند مشہور حُفّاظ صحابہ کے نام نامی کی فہرست دیتے ہیں - جو ہمارے دعوے کی مویّد ہے -

حُفّاظ صحابہؓ کے نام ابوبکر صدیقؓ - عمر فاروقؓ - عثمانؓ - علیؓ - طلحہؓ - سعدؓ - ابن مسعودؓ - حذیفہؓ - سالم مولے حذیفہؓ - ابوہریرہؓ - عبد اللہ بن سائبؓ - عبد اللہؓ بن عمر - عبادہ بن صامت ابوحلیمہؓ - مجمعؓ بن جاریہ - (دو سُورتیں کم) - فضالہؓ بن عبید - مسلمہؓ بن مخلد - تمیم داریؓ - عقبہ ابنؓ عامر - ابو موسے اشعریؓ - عائشہ صدیقہؓ - اُم المومنین حفصہؓ و اُمّ سلمہؓ - اُمّ ورقہ رضی اللہ عنہم و عنہن - ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات حافظ تھے - چنانچہ صرف ایک غزوۂ بئرمعونہ میں ستر قُرّاء (حافظان کلام مجید) شہید ہوئے ہیں - اور غزوۂ یمامہ میں (جو رسول کریم کی رحلت فرمائی کے تھوڑے ہی دنوں بعد کا واقعہ ہے) بھی ستر کے قریب قاری شہید ہوئے جس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ الوقت کی خدمت میں اہمیّت واقعہ کو ظاہر کر کے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی - کہ قرآن شریف ایک جلد میں جمع کر دیا جائے؛

اس موقعہ پر ایک خیال پیدا ہوتا ہے - کہ ممکن ہے - کہ جملہ قُرّاء میں اکثر یا بعض حضرات ایسے بھی ہونگے - جن کو تمام کلام مجید یاد نہ ہو - بلکہ وہ صرف ناظرہ خواں ہوں - کیونکہ تعلیم کتاب کے لیئے یہ ضروری نہیں ہے - کہ معلّم کو وہ کتاب یاد بھی ہو - اگر یہ بات مان بھی لیجائے تاہم اس سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا - کہ قاریوں یعنی قرآن کی تعلیم دینے والوں کے پاس قرآن شریف کا کوئی مکمّل نسخہ ضرور ہونا چاہیئے - جو تمام سورتوں کی ترتیب اور ہر ایک سورت کی اندرونی ترتیب آیات کا جامع ہو - خواہ وہ قرآن کسی ظاہری لوح پر لکھا ہوا ہو - خواہ دل

کی لوح پر کندہ ہو - اس لیئے کہ کتاب کی تعلیم کے لیئے اس کتاب کا ایک خاص ترتیب پر مرتب ہونا ضروری ہے - اور اس تحریر سے ہمارا مقصود بھی یہی ہے - کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں سارے کا سارا قرآن مجید کیا بلحاظ ترتیب سُوَر اور کیا بلحاظ ترتیب آیات کامل و مکمّل تھا - اور بہت سے حضرات صحابہ کرام نے اسے پڑھا - اور پڑھایا کرتے تھے؛

علاوہ اس کے جب ہم عامہ جماعت صحابہؓ پر نظر ڈالتے ہیں - تو ہمیں ان کے سینوں میں بھی قرآن شریف محفوظ دکھائی دیتا ہے - اس لیئے کہ حافظانِ کلام مجید کے سوائے دُوسرے دُوسرے صحابہ کرام کو بھی کلام مجید کے اکثر حصّے یاد تھے - جیسے کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں - کہ فرض نمازوں کے ادا کرنے کے لیئے ہر ایک مسلمان پر کچھ نہ کچھ حصّہ کلام مجید کا یاد رکھنا ضروری ہے - پس کسی صحابی کو سورۂ بقر یاد تھی - اور کسی کو سورۂ آل عمران اور کسی کو سورۂ یوسف علےٰ ہذا القیاس - ہر ایک صحابی نے اپنے سینے میں کلام مجید کا کلاً یا جزءاً ضرور محفوظ کیا ہوا تھا - اور اس حفظ کا قدرتی معاون ذریعہ طرز نزولِ کلام مجید تھا - کہ ایک آیت یا سُورت کے نازل ہونے کے بعد دُوسری آیت یا سُورت کے نازل ہونے میں اتنا وقفہ ضرور ہوتا تھا - کہ سُورت آسانی سے یاد ہو سکتی تھی -

اسلامی تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے - کہ کلام مجید کا نزول بتدریج تیئیس ۲۳ سال میں ہوا ہے جب ہم آجکل کی قرآنی درسگاہوں پر نظر ڈالتے ہیں - تو ہمیں بہت سے ایسے کمسن بچے دکھائی دیتے ہیں - جنہوں نے تین سال یا اس سے کم و بیش عرصہ میں سارا کلام مجید یاد کر لیا ہے - تو اس بات کے سمجھنے میں ذرا بھر بھی مشکل نہیں رہتی - کہ قرآن شریف کا یاد کر لینا صحابۂ کرامؓ کے لیئے اتنی وسیع مدت میں نہایت ہی آسان تھا - اور اسی لیئے اس کثرت سے اُن میں حفّاظ بھی موجود ہو گئے تھے؛

قرآن شریف کس طرح لکھا گیا

ہم اوپر لکھ آئے ہیں - کہ جوُں ہی کسی آیت کا نزول ہوتا تھا - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے موافق وہ اُسی وقت تحریر میں ضبط کر لی جاتی تھی - تاریخ شہادت دیتی ہے -

کہ قرآن مجید کا نزول دفعۃً نہیں ہوا - بلکہ حسب اقتضائے وقت منشائے الٰہی کے مطابق بتدریج تئیس سال کے عرصہ میں ہوتا رہا ہے - اور ہر ایک سُورت کی آیتوں کا نزول ترتیب وار بطریق تسلسل بھی نہیں ہوا - بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے - کہ ابھی ایک سُورت مکمّل نہ ہونے پائی تھی - کہ درمیان میں دُوسری سُورت نازل ہونی شروع ہوجاتی تھی - بعض وقت تین تین چار چار مختلف سُورتوں کی آیتیں بلاترتیب ایک ہی وقت میں نازل ہوجاتی تھیں - اور یہ بھی نہیں تھا - کہ سُورتوں کی آیتیں نزولی ترتیب کے موافق یکے بعد دیگرے لکھ لی جاتی تھیں - بلکہ بعض اوقات رسول کریمؐ نے آخر سُورت میں نازل شدہ آیت کو وسط سُورت یا اوّل سُورت میں تحریر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے - بعض کو کسی دُوسری آیت میں ضم کردینے کا حکم دیا ہے - اور بعض سُورتیں ایسی بھی ہیں - کہ دفعتہً واحدۃً ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہیں - الغرض تئیس ۲۳ سال میں علے التواتر قرآن شریف کا نزول ہوتا رہا ہے - جس میں نہ تو سُورتیں ترتیب وار نازل ہوئیں - اور نہ ہی سورتوں کی آیتوں کا بطریق تسلسُل نزول ہوا ہے - لہٰذا زمانۂ نزول کلام مجید میں اس کی تحریر کی یہی صُورت ممکن ہوسکتی تھی - کہ ہر ایک سُورت بلکہ ہر ایک آیت کو علیحدہ علیحدہ ایک خاص نشان کے ساتھ اس طریق پر لکھا جائے - کہ اگر کسی آیت کو مقدّم یا مؤخّر کرنے کی ضرورت ہو - تو آسانی کے ساتھ اس کا عمل ہوسکے چنانچہ اسی ترتیب پر آیتیں اور سورتیں علیحدہ علیحدہ تحریر میں ضبط کر لی جاتی تھیں سِلسلۂ نزول وحی چونکہ رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر تک جاری رہا ہے - اس لئے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کی حین حیات قرآن مجید کی تمام سُورتیں ترتیب وار ایک جلد میں جمع نہیں ہوئیں - اور ہوسکتی بھی نہ تھیں - لیکن بجائے خود تمام سُورتیں کامل ومکمّل ہوچکی تھیں - اور ان کی آیات کی اندرونی ترتیب و تہذیب کا بھی ایسا مکمّل انتظام ہوچکا تھا - کہ یہ کہا جاسکتا تھا - کہ فلاں سُورت کی اتنی آیتیں ہیں - اور فلاں آیت کا یہ نمبر ہے - یہ سُورتیں اور آیتیں ترتیب وار بظاہر ایک جلد میں تو جمع نہیں تھیں - لیکن حُفّاظ کے زندہ دلوں کے الواح پر ترتیب وار نہایت عمدگی سے کندہ تھیں - پس

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کلام مجید پُوری ترتیب کے ساتھ جمع تو تھا - لیکن یہ جمع شدہ قرآن صرف حافظوں کے سینوں ہی میں محفوظ تھا - اور ایک کتاب یا ایک جلد میں ترتیب اور اس کی تمام سُورتیں جمع نہ تھیں - بلکہ متفرق طور پر علیحدہ علیحدہ پرچوں پر لکھی ہوئی تھیں - البتہ ان کی آیتوں کی اندرونی ترتیب بالکل کامل و مکمّل اور منتظم تھی - سینکڑوں قاری و حافظ ایسے تھے - جن کو تمام کلام مجید اَلْحَمْدُ سے لے کر وَالنّاس تک ازبر یاد تھا - بعض حضرات ایک رات میں ہر روز ختم بھی کرلیا کرتے تھے - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تلاوت فرماتے تھے - اور دوسروں سے سُنا بھی کرتے تھے - جیسے کہ ہم پچھلی بحثوں میں بوضاحت لکھ آئے ہیں - اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی سُورتوں کو ایک خاص ترتیب پر مرتب کیا ہوا تھا - اس لئے بدونِ ترتیب خاص قرآن جیسی ضخیم کتاب کی تلاوت بر مواظبت نہیں ہوسکتی - اور تمام صحابہ کرامؓ بھی اُسی نبوی ترتیب قرآن کے عامل تھے - یہ ایک لغو خیال ہے - کہ کہا جائے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تلاوت کا طریق تو کچھ اور تھا اور صحابہؓ اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دئیے ہوئے کلام اللہ کی تلاوت کرتے تھے - یعنے یہ کہنا - کہ سُورتیں بلحاظ ترتیب آیات اگرچہ مکمّل تھیں - لیکن خود سُورتیں چونکہ ترتیب وار مرتّب نہ تھیں - اس لئے ممکن ہے - کہ ایک صحابی کی تلاوت میں جو سورتوں کی ترتیب ہے دُوسرے کی تلاوت میں وہ نہ ہو - یہ خیال باطل ہے - اس لئے کہ جب یہ ثابت ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام کلام مجید کی تلاوت فرماتے تھے - اور ایک سُورت کے بعد دوسری سُورت ملا کر پڑھا کرتے تھے - تو صحابہؓ کو اس نبوی ترتیبِ سُوَر کے برخلاف سُورتوں کو ترتیب دینے کی کیا ضرورت تھی؟

سر ولیم میور کے خیالات ترتیب سُوَر کے متعلق

پادری ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمدؐ کے ایک مقام پر قرآنی سُورتوں اور ان کی آیتوں کی ترتیب پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے

"بہرحال اتنا تو ضرور ہے - کہ اکثر سُورتوں کی اندرونی ترتیب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت سے نہیں ہے -"

اور پھر حاشیہ پر لکھتے ہیں۔ کہ "یہ بات لکھی ہوئی موجود ہے۔ کہ بعض صحابہ سارے قرآن شریف کی معیّن وقت میں تلاوت کر سکتے تھے۔ جس سے یہ بات قرار دینی پڑتی ہے۔ کہ اس میں بعض حصص قرآنی کا باہمی تعلق اور ربط ضرور تھا"

ایک اور حاشیہ میں لکھتے ہیں۔ کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حین حیات میں چار پانچ تو ایسے صحابی موجود تھے۔ جو کامل قرآن شریف کو نہایت صحت کے ساتھ ازبر رکھتے تھے۔ اور اکثر ایسے بھی موجود تھے۔ کہ قریباً سارا قرآن ازبر رکھتے تھے"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں "لیکن اس بات کو ماننے کے لئے بہت سے وجوہ ہیں۔ کہ بڑی بڑی سُورتیں اور اُن کی آیات جو زیادہ تر مستعمل تھیں۔ معیّن ہو چکی تھیں۔ اور اپنے اپنے ناموں اور خاص نشانوں سے موسوم و معروف تھیں۔ اور صحیح حدیثوں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود یوں بعض سُورتوں کا موسوم کرنا ثابت ہے۔ مثلاً جب غزوۂ حُنین میں بعض لوگ بھاگے۔ تو اس وقت اُن کو آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلم) نے اصحابِ بقر کر کے پُکارا تھا"

اور ایک اور جگہ لکھتے ہیں "احادیث سے یہ بات ثابت ہے۔ کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں اکثر صحابیوں نے قرآن شریف کی بعض سورتیں حفظ کر لی ہوئی تھیں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دہن مبارک سے قرآن شریف کی ستر سُورتیں سیکھی تھیں۔ اور آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلم) نے آخری مرضِ موت کے ایاّم میں ستّر سُورتیں تلاوت فرمائی تھیں۔ جن میں سات لمبی سورتیں تھیں۔ ان حدیثوں سے کم از کم قرآنی سورتوں کی آیتوں میں ایک حد تک معیّن ترتیب ضرور ثابت ہوتی ہے۔ البتہ سُورتوں کی ترتیب کا اس سے پتہ نہیں لگ سکتا"

ایک اور جگہ "حدیث مذکورہ بالا جس میں سُورتوں کی وہ تعداد لکھی ہے۔ جو بعض صحابہ کو یاد تھیں۔ اور نیز وہ تعداد جو خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آخری وقت میں پڑھی تھیں۔ مذکور ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ سورتیں اس وقت مکمّل اور مرتب صورت میں موجود تھیں"

ایک اور جگہ "جبکہ یہ بات ثابت ہے۔ کہ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سُورہائے قرآنی کا استعمال کیا کرتے تھے۔ تو اس سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے۔ کہ سُورتوں کی ترتیب کا کس حد تک آپؐ نے ضرور فیصلہ کر دیا ہوا تھا" انتھی از لائف آف محمدؐ

ولیم میور کے خیالات کے اضطراب کا اظہار

پادری ولیم میور نے متن کتاب میں تو سُورتوں کی ترتیب سے انکار کیا ہے۔ لیکن اسلامی تاریخی شہادتوں نے اُسے اس بات پر مجبور کر دیا ہے۔ کہ اس کا انکار صحیح نہیں۔ جبکہ حواشی میں وہ خود معترف ہیں کہ "ایام مرض میں خود آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ستر سورتیں تلاوت فرمائی ہیں۔ جن میں سات لمبی سورتیں تھیں" تو اب باقی قرآن شریف کے آخری حصّہ کی کل چالیس ۴۰ سُورتیں رہ جاتی ہیں۔ جو بالکل چھوٹی چھوٹی ہیں۔ اور سب ملکر ایک لمبی سُورت کے برابر بھی نہیں ہوتیں۔ اور عام نمازوں میں اکثر لوگ انہیں پڑھا کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپؐ کو انتیس پارے تو یاد ہوں۔ اور ایک اخیر کا پارۂ قرآن یاد نہ ہو۔ اور پارہ بھی وہ جسکو عام بچّے اور عورتیں بھی یاد رکھتی ہیں۔ اور جو کہ نزول میں قریباً اوّل النزول ہے پھر لکھتا ہے۔ کہ چار پانچ صحابی ایسے موجود تھے۔ کہ کل کا کل قرآن مجید ازبر رکھتے تھے۔ اور معیّن وقت میں اُسے دُہرا سکتے تھے" اس سے بڑھ کر ترتیب سُور کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

ترتیب سُور قران پر حدیث کی شہادت

اس موقعہ پر ہم ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں۔ جس سے ہمارے دعوے کی صحّت پر اور بھی روشنی پڑتی ہے۔ احمد ابوداؤد وغیرہم لکھتے ہیں۔

عن اوس ابن ابی اوس عن حُذَیفۃِ الثَّقَفِی قَالَ کُنْتُ فِی وَفْدِ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا مِنْ ثَقِیْفٍ فَقَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَرءَ عَلَیَّ حِزْبِیْ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَاَرَدْتُ اَنْ لَّاۤ اُخْرِجَ حَتّٰی اَقْضِیَہٗ قَالَ فَسَأَلْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَیْفَ تُحَزِّبُوْنَ الْقُرْاٰنَ قَالُوْا نُحَزِّبُہٗ ثَلَاثَ سُوَرٍ وَخَمْسَ سُوَرٍ وَسَبْعَ سُوَرٍ وَتِسْعَ سُوَرٍ وَاِحْدٰی

عَشْرَةَ سُوَرٍ وَثَلَاثَ عَشْرَةَ سُوَرٍ وَحِزْبِ الْمُفَصَّلِ مِنْ قٓ حَتّٰی نَخْتِمَ -

اوس حذیفہ ثقفی سے روایت کرتے ہیں - کہ ثقیف کی اس وفد میں جو اسلام لانے والی تھی - میں بھی تھا - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - کہ میں نے قرآن شریف میں سے اپنی ایک منزل کو پورا کرنا ہے - اس لئے میں ارادہ کرتا ہوں - کہ جب تک ختم نہ کروں - اُس وقت تک باہر نہ نکلوں - اس پر ہم نے اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا - کہ تم نے کس طرح قرآن کریم کی منزلیں مقرر کی ہوئی ہیں - اُنہوں نے کہا - تین سُورتوں - پانچ سُورتوں - سات سُورتوں - نو سُورتوں - گیارہ سُورتوں - تیرہ سُورتوں اور قٓ سے شروع ہو کر آخر قرآن تک (جن کو مفصّل کہتے ہیں) سات حصّوں میں یعنے قرآن مجید کی سات منزلیں ہیں - واضح ہو - کہ اس حدیث میں سورۂ فاتحہ جو قرآن شریف میں اوّل لکھی ہوئی ہے - شمار نہیں کیگئی - اور یہ امر کسی غلطی پر مبنی نہیں ہے ؎

ابن حجر لکھتے ہیں - یہ حدیث صاف بتا رہی ہے - کہ آج جس انداز پر مُصحف مجید میں سُورتوں کی ترتیب پائی جاتی ہے - یہی ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی تھی ❖

آیتوں اور سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے

الغرض ترتیب آیات و ترتیب سور کے متعلق اُمّت کا اجماع ہے - کہ وہ توقیفی ہیں - یعنے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جبرئیل علیہ السلام کی ہدایت کے موافق ترتیب دیا ہے - صرف ایک سورہ برأت کے متعلق اختلاف ہے - جیسے کہ حضرت ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے - جس کو ترمذی - ابو داؤد - نسائی تینوں نے نقل کیا ہے - کہ ابن عباس نے عثمان ابن عفان سے کہا - کہ سورۂ انفال جو مثانی میں سے ہے - اور سورہ براۃ کہ مئین سے ہے - ان دونوں کو کس مناسبت سے تم نے ملا دیا ہے - اور ان کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھی - اور سبع طوال میں شامل کر دیا ہے - عثمان نے کہا - کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں جس وقت کوئی آیت نازل ہوتی - آپ صلعم فوراً کاتب وحی کو بُلا کر بتلا دیتے - کہ یہ آیت فلاں سُورت کی ہے - اس کو فلاں آیت کے بعد اور فلاں آیت سے پہلے لکھو - سورہ انفال اُس

وقت نازل ہوئی تھی - جبکہ ابتداءً آپ صلعم مدینہ میں تشریف لائے تھے - اور براۃ سب کے اخیر میں نازل ہوئی ہے - ان دونو سورتوں کا قصّہ اور مضمون ملتا جُلتا ہے - اس لئے میں نے یہی خیال کیا - کہ براۃ سورہ انفال کا بقیہ ہے - اسی اثنا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے - اور اس سورۃ کے متعلق ہم سے کچھ ارشاد نہ ہوا - اس لئے میں نے ان دونو سورتوں کو ایک کر دیا ہے - اور بسم اللہ الرحمن الرحیم درمیان میں نہیں لکھی - اس حدیث سے آیات اور سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا البتہ سورۂ براۃ کی ترتیب توقیفی نہیں معلوم ہوتی - لیکن غور سے دیکھنے کے بعد یہ حدیث بھی مخدوش معلوم ہوتی ہے - کیونکہ جب یہ ثابت ہے - کہ عہد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں

عہد نبوی میں سورۂ انفال کے بعد سورہ توبہ پڑھی جاتی تھی

تمام کلام مجید اَلْحَمْدُ سے وَالنَّاس تک یاد پڑھا جاتا تھا - اور کئی صحابی کامل حافظ تھے - تو پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ انفال کے بعد سورہ براۃ نہیں پڑھی جاتی تھی - بلکہ کوئی اور سُورت پڑھی جاتی تھی - البتہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے - کہ عند التلاوت انفال اور براۃ میں بواسطۂ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فصل نہیں کیا جاتا تھا - اور بس ؎

قرآن کی سُورتوں کے نام توقیفی ہیں - یعنی خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معیّن کئے ہوئے ہیں - بعض سُورتوں کے نام ایک سے زیادہ بھی ہیں - مثلاً سورۂ فاتحہ کے

سُورتوں کے نام توقیفی ہیں

پچیس ۲۵ نام ہیں - ان سُورتوں کی باعتبار تعداد آیات چار قسمیں ہیں - اس کے متعلق امام احمد بن حنبل ایک روایت بیان کرتے ہیں - کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھے بجائے توریت کے سبع طوال اور زبور کے عوض مئین اور بمقابلہ انجیل مثانی عطا کی گئی ہیں - اور یہ میری فضیلت ہے - کہ ان کے علاوہ مجھے مفصّل بھی عطا ہوئی ہیں -

سورتوں کے اقسام

(۱) سبع طوال - (سات بڑی بڑی سُورتیں ہیں) بقرہ - آل عمران - نساء - مائدہ - انعام - اعراف - انفال مع براۃ ؎

(۲) مئین - (وہ سُورتیں ہیں - جن میں کم و بیش سو آیتیں ہیں -) سُورۂ یونس سے فاطر تک ؎

(۳) مثانی - (وہ سورتیں ہیں - جن میں کے قصے اکثر دہرائے گئے ہیں - اور نصائح مکرر بیان ہوئے ہیں) سورہ یٰس سے سورہ قٓ تک ؕ

(۴) مفصّل - (جدا جدا اور علیحدہ علیحدہ مضمون والی سورتیں) سورۂ قٓ سے آخر کلام مجید تک ؕ

مفصّل کی پھر تین قسمیں ہیں - طِوال - اَوساط - قِصار ؕ

(طوال) قٓ سے والمرسلات تک - (اوساط) سورہ نبا سے والضحےٰ تک - (قصار) سورہ الم نشرح سے والنّاس تک ؕ

مَصاحفِ ابی بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ

قال اللہ تعالےٰ - اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ - سورہ قیٰمہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ وعدہ موجود ہے - کہ جیسے قرآن کریم کا پڑھانا یعنے رسول کریم کو پڑھانا ہمارا کام ہے اسی طرح قرآن کریم کی جمع بھی ہمارا ہی کام ؕ

قرآن کریم کی تعلیم و تعلّم کا ذکر تو ہم کر آئے ہیں - اب دیکھنا یہ ہے - کہ اس دوسرے وعدۂ الٰہی کے ایفا کا کیا طریق ہوا - یعنے قرآن شریف کس طرح جمع (لکھا) کیا گیا - اوپر کی بحثوں میں ہم بوضاحت لکھ آئے ہیں - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حین حیات میں تمام کلام مجید تحریر میں ضبط تو کر لیا گیا تھا - لیکن ترتیب وار مسلسل تمام سورتیں ایک جلد میں جمع (لکھی) نہیں ہوئی تھیں - اور جمع ہو سکتی بھی نہ تھیں - کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر تک قرآن کا نزول ہوتا رہا ہے - لیکن زمانۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد جب کہ تمام کلام مجید کو ایک جلد میں جمع کر دینے کی وہ تمام دقتیں رفع ہو گئیں - جو زمانۂ نزول میں تحریر قرآن کے لئے لازمی تھیں - تو حسبِ وعدۂ الٰہی حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اوّل کے عہد مبارک میں کلام مجید کی وہ تمام آئتیں اور سورتیں جو علیحدہ علیحدہ پرچوں پر لکھی ہوئی غیر مرتب پڑی تھیں - اُسی ترتیب کے ساتھ ایک جلد میں جمع کر دی گئیں - جس ترتیب پر خود رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حُفّاظ کے پاک صاف سینوں میں جمع فرمایا تھا - پس وعدہ جمع قرآن کریم

کی ایفا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں خود آپ صلعم کے ہاتھوں سے ہو چکی تھی - لیکن اتمام ایفائے وعدہ اور اس کی تکمیل و تہذیب کا سہرا حضرت ابوبکرؓ کے سر پر باندھا گیا - وَذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ ◆

اِحساسِ ضرورتِ جمع کلام مجید

صحیح بخاری میں ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند روز بعد مُسَیلمہ کذّاب کی سرکوبی کے لئے حضرت ابوبکرؓ نے ایک جرّار لشکر روانہ کیا - اس معرکہ میں مُسَیلمہ تو مارا گیا - مگر بارہ سو کے قریب صحابہ بھی شہید ہو گئے - جن میں سے سات سو قرآن دان اور خصوصاً ستّر قاری بھی تھے - اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا - کہ اگر ایسی ہی اور بھی خطرناک لڑائیاں پیش آئیں - تو ممکن ہے - کہ اکثر قرّاء شہید ہو جائیں - اور اس طرح کوئی حصّہ کلام مجید کا ضائع ہو جائے - لہٰذا انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کریم کی طرف توجہ دلائی - حدیث یہ ہے :-

حدثنا موسی ابن اسمٰعیل عن ابراھیم بن سعد - حدثنا ابن شھاب عن عبید ابن السباق ان زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ قَالَ اَرسَلَ اِلَیَّ اَبُوبَکرٍ الصِّدِیق مَقْتَلَ اَھْلِ الیَمَامَۃِ فَاِذَا عمر ابن الخطاب عِنْدَہٗ قال ابوبکر رضی اللہ عنہ اِنَّ عُمَرَ اَتَانِی فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ یَوْمَ الْیَمَامَۃِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ وَ انّی اخشی اَنْ یَّسْتَحِرَّ القتل بالقراء بالمَوَاطِنِ فیذھب کثیراً مِنَ القراٰن وانی اری اَنْ تَامُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰن قُلْتُ لِعُمَرَ کَیْفَ تَفْعَلُ شیئًا لَمْ یَفْعَلْہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ھٰذَا وَ اللّٰہِ خَیْرٌ فَلَمْ یَزَلْ عمر یُرَاجِعُنِیْ حَتّٰی شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرِیْ لِذَالِکَ وَرَأیتُ فِیْ ذٰلِکَ الَّذِیْ رَاٰی عمر - قَالَ زَیْدٌ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ اِنَّکَ رَجُلٌ شَابٌّ

عاقل لانتہمک وقد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القرآن فاجمعہ فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی بہ من جمع القرآن - قلت کیف تفعلون شیئاً لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو واللہ خیر فلم یزل ابوبکر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری للذی شرح لہ صدر ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما - فتتبعت القرآن اجمعہ من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی وجدت اٰخر سورۃ التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہ لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم - حتی خاتمۃ البراۃ فکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاتہ ثم عند حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ ؎

(ترجمہ) زید بن ثابت فرماتے ہیں - جنگ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی مجھے بلوا بھیجا - جب میں آپ کے پاس پہنچا - حضرت عمر بھی وہیں موجود تھے - حضرت ابوبکرؓ مجھے فرمانے لگے - ابھی عمرؓ میرے پاس آئے - اور کہا - یمامہ کے جنگ میں قرآن کریم کے قاریوں میں بہت قتل واقع ہوا ہے - میں ڈرتا ہوں - کہ اور میدانوں میں بھی اگر اسی طرح قاری لوگ قتل ہوتے رہے - تو بہت سا حصہ قرآن کریم کا ضائع ہو جائیگا - میری یہ رائے ہے - کہ آپ جمع قرآن کا حکم دیں - میں نے عمر سے کہا - تم کیونکر اس کام کو کرتے ہو - جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا - عمر نے جواب دیا - خدا کی قسم اس میں بہتری ہے - پس عمرؓ میرے ساتھ بحث کرتے رہے - کہ میرے سینے کو بھی اللہ تعالےٰ نے اس کے لئے کھولدیا - اور میری بھی اس میں وہی رائے ہو گئی جو عمر کی رائے تھی - پھر ابوبکرؓ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا - تم عقلمند اور جوان آدمی ہو - ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے - اور تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی بھی لکھا کرتے تھے - پس قرآن کی تلاش کر کے اسے

ایک جلد میں جمع کر دو - خدا کی قسم اگر مجھے اس بات پر مجبور کرتے کہ تم ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کر دو - تو یہ بات مجھے زیادہ دشوار نہ معلوم ہوتی - بہ نسبت اسکے کہ مجھے جمع قرآن کا حکم دیا - مینے کہا - تم کسطرح وہ کام کرتے ہو - جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا - حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا - واللہ یہ بہتر ہے - پس حضرت ابوبکرؓ مجھے جواب دیتے رہے - یہاں تک کہ خداوند نے میرا سینہ اس بات کے لیے کھول دیا - جس کے لئے اس نے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہما کے سینے کھول دئیے تھے - پھر مینے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا - اور میں اُسے جمع کرتا تھا - کھجور کی ٹہنیوں - پتھر کی تختیوں اور آدمیوں کے سینوں یعنے حافظوں سے یہاں تک کہ آخر سورۂ توبہ کی آیتیں مجھے ابوخزیمہ انصاری کے پاس سے ملیں - یعنے لَقَدْ جَاءَکُمْ رَسُوْلٌ سے خاتمہ براۃ تک - پس یہ صحیفے ابوبکرؓ کے پاس رہے - جب خدا تعالےٰ نے ان کو وفات دی - تو پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے - اور اُن کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے پاس - انتہیٰ -

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے توقف سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا - کہ وہ کلام مجید کے غیر منضبط ہونے کے باعث متردد ہوئے تھے - نہیں بلکہ ان کے دل میں قرآن شریف کے ضائع ہونے کا وہم تک بھی نہیں گذرتا تھا - اور کیوں گذرتا - حُفّاظ کثرت سے موجود تھے - قرآن کریم کی تعلیم و تعلّم کا رواج عالمگیر ہو چکا تھا - اور اس کی آیتیں و سُورتیں لکھی جا چکی تھیں - لیکن چونکہ حضرت عمرؓ کی تحریک کے دلائل قوی تھے - اور مناسب وقت تجویز تھی - لہذا حضرت ابوبکرؓ اور ایسے ہی حضرت زید بھی جمع کلام مجید پر متفق ہو گئے - اور تمام صحابہ کرام نے بھی اس تجویز کو بطیب خاطر پسند کر لیا +

کلام مجید کس طرح پر جمع کیا گیا

کلام مجید کو ایک جلد میں جمع کر دینے کی تجویز جب قائم ہو گئی - تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم ہوا - کہ کوئی آیت تحریری ثبوت کے بغیر نہ لی جائے - اس لئے حضرت زید کے پاس

پہلے وہ تمام چیزیں جمع کرادی گئیں۔ جن پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاص اہتمام سے آیتیں اور سورتیں لکھوائی تھیں۔ اس کے بعد بواسطۂ منادی تمام وہ تحریریں بھی اکٹھی کر لی گئیں۔ جو متفرق طور پر اکثر صحابہ کرام کے ہاتھوں میں محفوظ تھیں۔ اگر کوئی شخص ایسی آیت پیش کرتا۔ جس کی تحریر دوسرے صحابہ سے نہ ملتی۔ تو وہ بغیر دو معتبر شہادتوں کے قبول نہیں کی جاتی تھی ؎

صحیح بخاری کے باب جمع قرآن کی ایک حدیث کی تشریح میں صاحب فتح الباری جلد ۹ میں لکھتے ہیں۔ وَقَدْ کَانَ القرآن کُلُّہٗ کُتِبَ فی عَھْدِ النَّبِیِّ لٰکِنْ غَیْرَ مجموعٍ فی مَوْضِعٍ واحدٍ فَلَمْ یَاْمُرْ ابوبکرٍ اِلَّا بِکتابۃِ مَا کَانَ مکتوباً وَلِذٰلِکَ تَوَقَّفَ زَیْدٌ عَنْ کتابۃ من اٰخر سورۃ براءۃ حتّٰی وجدھا مَکْتُوباً مَعَ اَنَّہٗ کَانَ یَسْتَحْضِرُھَا ھُوَ وَمَنْ ذَکَرَ مَعَہٗ ۔

(ترجمہ) ۔ تمام قرآن شریف عہد نبی صلّی اللہ علیہ وسلم میں لکھا جا چکا تھا۔ لیکن تمام ایک جگہ جمع نہ تھا۔ پس حضرت ابوبکرؓ لکھی ہوئی آیتوں کے بغیر کسی اور شے کے لکھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت زید سورہ براۃ کے آخری حصّے کی آیات کے جمع کر لینے میں اس وقت تک رُکے رہے۔ جب تک کہ وہ لکھی ہوئی ان کو نہ مل گئیں۔ باوجودیکہ زید اس بات کو جانتا تھا۔ کہ وہ سورہ براۃ کی آخری آیات ہیں ؎

ابن ابی داوٗد لکھتے ہیں۔ اِنَّ اَبَا بکرٍ قال لعمر ولزیدٍ اقعُدا علٰے باب المسجد فَمَنْ جَاءَ کُمَا بِشَاھِدَیْنِ عَلٰے شَیْءٍ من کِتَابِ اللّٰہِ فَاکْتُبَاہُ ۔ کہ حضرت ابوبکرؓ نے عمروزید کو حکم دیا۔ کہ تم مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ۔ اور جو شخص کوئی آیت کلام اللہ کی لائے۔ اور دو شاہد اس کی تصدیق کریں۔ اسے مصحف میں لکھ لو۔

شارح بخاری شاہدین کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ وَکَانَ المُرَادُ بِالشَّاھِدَیْنِ الحِفْظُ وَالْکِتَابُ اَوِالمُرَادُ اَنَّھُمَا یَشْھَدَانِ عَلٰے اَنَّ ذٰلِکَ المَکْتُوْبَ کُتِبَ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وسلم ۔ فتح الباری جلد ۹ ۔ یعنے شاہدین سے یہ مراد ہے۔ کہ وہ آیت حفاظ کو یاد ہو اور لکھی ہوئی بھی ہو۔ یا اس پر دو گواہ گواہی دیں۔ کہ

کہ یہ آیت دربار نبوی میں رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی ہے ۔

ابن ابی داوٗد لکھتے ہیں۔ قَالَ قام عمر فقَالَ مَنْ کَانَ تَلَقّٰی مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَیْئاً مِنَ الْقُرْاٰنِ فلیأتِ بِہٖ وکانوا یکتبون فی الصحفِ والالواحِ وَالعُسُبِ قَالَ وَکَانَ لَا یُقْبَلُ مِنْ اَحدٍ شَیْئاً حتّٰی یشھد شَاھِدَانِ ۔

راوی کہتا ہے۔ (مسجد کے سامنے) حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر سب سے کہدیا۔ کہ جس کو قرآن شریف کا کوئی حصّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے براہِ راست پہنچا ہے۔ وہ اسے لے آوے۔ اور صحابہ قرآن شریف کو کاغذوں تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ اور کسی سے کوئی چیز (لکھا ہوا قرآن مجید کا ٹکڑا) قبول نہ کی جاتی تھی جب تک اس پر دو گواہ گواہی نہ دیتے۔ یعنے حضرت زید اگرچہ کاتب وحی اور سارے قرآن شریف کے حافظ تھے۔ لیکن مزید احتیاط کے لئے جو کچھ لکھا ہوا پاتے۔ اس پر دو معتبر گواہ لے لیتے تھے۔ کہ جو کچھ لکھا گیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا ہے

قال و فائدۃ التَّتَبُّع المُبَالِغَۃ فِی الاِسْتِظْھَارِ وَالوُقُوْفِ عِنْدَ مَا کُتِبَ بَیْنَ یَدَیِ النَّبِی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ۔ یعنی اس ساری کوشش کی غرض یہ تھی۔ کہ جو کچھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا ہے۔ اس کی پوری تحقیق و تنقید ہو جائے (ابن ابی داوٗد)

زید کی تحریر مصحف کا طریقہ

پس حضرت زید حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت کے موافق پہلے ہر ایک آیت کو نبوی تحریری ذخائر سے تلاش کرتے اور پھر اس کا دوسری تحریروں اور حفاظ کے سینوں سے مقابلہ کر کے لکھ لیتے تھے۔ صرف حفاظ اور صرف تحریر کے اعتماد پر نہیں جمع کرتے تھے۔ احتیاط یہ تھی۔ کہ سورہ براۃ کی آخری آیتیں اس وقت تک انھوں نے مُصحف میں جمع نہ کیں۔ جب تک کہ انہیں تحریری ثبوت نہیں ملا۔ باوجودیکہ زید خوب جانتے تھے۔ کہ وہ سورہ براۃ کی آیتیں ہیں۔ اس لئے کہ وہ خود حافظ تھے۔ اور دوسرے صحابہ حُفّاظ کے سینوں کے ذخیروں میں بھی

ایسا ہی ان آیتوں کو موجود پاتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی تحریر نہیں ملتی تھی۔ اس لئے وہ ان آیتوں کے لکھنے میں جراُت نہیں کرتے تھے۔ آخر ابوخزیمہ انصاری کے پاس سے ان کی تحریر دستیاب ہوگئی۔ عام تحریر نہ ملنے کا باعث یہ ہے۔ کہ یہ دو آیتیں آخر زمانۂ نبوت میں نازل ہوئی ہیں۔ اس لئے سب کے پاس ان کی تحریر نہ تھی جیسے کہ صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت زید کہتے ہیں۔ فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْاٰن اجمعہ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُوْرِ الرِّجَالِ حَتّٰی وَجَدْتُ اٰخِرَ سُوْرَۃِ التَّوْبَۃِ مَعَ اَبِیْ خُزَیْمَۃِ الْاَنْصَارِیْ لَمْ اَجِدْھَا مَعَ اَحَدٍ غَیْرِہٖ۔ لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ الخ خاتمہ البراۃ

(ترجمہ) پس میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اور میں اسے جمع کرتا تھا۔ کھجور کی ٹہنیوں۔ پتھر کی تختیوں اور آدمیوں کے سینوں (حفاظ) سے یہاں تک کہ آخر سورۂ توبہ مجھے ابوخزیمہ انصاری کے پاس سے ملا۔ اور کسی کے پاس سے نہیں ملا۔ یعنی لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ۔ براۃ کے خاتمہ تک:

الغرض اس جانفشانی اور بکمال احتیاط غایت تحقیق و تنقید کے ساتھ سارے کا سارا کلام مجید کیا بلحاظ ترتیبِ آیات اور کیا بلحاظ عبارت اس مجموعہ مخزونہ سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور خاص اہتمام سے لکھا گیا تھا۔ اور اس مجموعہ سے جو حُفّاظ صحابہ کے سینوں میں محفوظ ہو چکا تھا۔ پوری پوری مطابقت کے ساتھ ایک جلد میں جمع ہوگیا۔ اور تمام صحابہ کرام نے اُسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر بکمال خوشی اپنی قرأت کی صحت کا مدار علیہ بنا لیا۔ کسی روایت یا حدیث میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں پایا جاتا۔ کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد مبارک میں جو قرآن کریم ایک جلد میں لکھا گیا۔ اس میں کچھ نقص تھا۔ اس طرح کہ اس میں کوئی آیت یا لفظ یا کوئی حصّہ کلام مجید کا داخل ہونے سے رہ گیا ہے۔ یا کوئی ایسا لفظ یا فقرہ داخل ہوگیا ہے۔ جو کلام الٰہی سے نہیں تھا۔

علاّمہ محاسبی لکھتے ہیں۔ کہ قرآن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی

میں مکمّل لکھوا دیا تھا۔ لیکن وہ چمڑوں۔ تختیوں اور کھجور کی پتیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا۔ اور متفرق تھا۔ حضرت ابابکر صدّیق نے انہی متفرق مکتوبات کو کمال صحت اور پوری احتیاط کے ساتھ لکھوا کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور شیرازہ لگا کر تاگے سے سی دیا۔ تاکہ اس کا کوئی ورق ضائع نہ ہو جائے۔ یہ مجموعہ بلا ایک حرف کے بھی تغیر و تبدّل یا کمی و بیشی کے بعینہٖ وہی قرآن ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور اسی حیثیت اسی انداز پر لکھا گیا۔ جس ترتیب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھوایا۔ اور حفظ کرایا تھا۔ اور بلا استثنا تمام صحابہ کا اس پر اتفاق تھا۔ کہ اس میں اس قدر احتیاط اور کوشش کی گئی ہے۔ کہ کوئی لفظ قرآن کا نہ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ نہ کوئی بڑھایا گیا ہے؛

مصحف صدیق کے متعلق پادری میور کی رائے

پادری میور جو کہ ایک متعصّب عیسائی ہے۔ مُصحف ابی بکرؓ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"کوئی فقرہ یا کوئی اجزاء یا کوئی الفاظ ایسے نہیں سُنے گئے۔ جو جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیئے ہوں۔ نہ ہی کوئی ایسے پائے جاتے ہیں۔ جو اس مسلّم مجموعہ سے اختلاف رکھتے ہوں۔ اگر ایسے کوئی اجزا یا فقرے یا الفاظ ہوتے تو ضرور تھا۔ کہ ان کا تذکرہ ان احادیث میں پایا جاتا۔ جن میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چھوٹی سی چھوٹی باتیں بھی اقوال و افعال کی نسبت محفوظ رکھی گئی ہیں۔ انتہی"

ایک میور ہی کی کیا تخصیص ہے۔ ہر ایک حق پسند معاملہ فہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس برمحل تحریکِ جمع قرآن اور حضرت صدّیق رضی اللہ عنہ کے اس اہتمامِ تحریر اور حضرت زید کی اس امانت و دیانت اور جانفشاں کوشش مقابلہ و تحریر کو وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ وہ مبارک تحریک و تجویز تھی۔ جس نے دنیا کے سامنے لَامِثْلَ لَہٗ ایک مثال پیش کر کے یہ ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ اس عالم کون و فساد (دنیا) میں ایک کتاب الٰہی کی حفاظت اس طرح ہو سکتی ہے۔ اس پر قرن درمیاں ہی کیوں نہ گذر

جائیں - کیا مجال کہ اس کے ایک لفظ یا حرف و نقطہ میں بال برابر فرق آجائے ؛

ہم اوپر لکھ آئے ہیں - کہ کسی کتاب کی حفاظت کے دو ہی ظرف ہو سکتے ہیں۔ (۱) حافظوں کے سینے (۲) اور صحیفوں کے بطون ؛ قدرت الہی نے قرآن شریف کی حفاظت کے لئے بھی یہی تجویز فرمائی - کہ جونہی کوئی آیت نازل ہوتی - فوراً تحریر میں ضبط کر لیجاتی اور حفاظ کی الواح قلوب پہ نہایت عمدگی سے کندہ کر دی جاتی - پس رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں سارے کا سارا کلام مجید ایک ظرف میں تو پوری طرح بکمال تہذیب ضبط ہو گیا تھا - کہ کئی حافظ و قاری ایسے موجود ہو گئے تھے - جو ایک رات میں سارا قرآن مجید اَلْحَمْدُ سے وَالنَّاس تک ازبر پڑھ سکتے تھے - اور دوسرے ظرف یعنے تحریر میں بھی بلا کم و کاست ضبط تو ہو گیا تھا - لیکن اس میں یہ کسر ابھی باقی تھی - کہ وہ سلسلہ وار ایک جلد میں جمع نہیں ہوا تھا - اور زمانہ نبوت میں (جو کہ نزول وحی کا زمانہ ہے) سلسلہ وار جمع ہو بھی نہیں سکتا تھا - پس قدرتِ الہی نے حضرت ابوبکرؓ - حضرت عمرؓ - حضرت زیدؓ کے ذریعے اس نقص کو بھی رفع کر دیا - اور اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ کے وعدہ جمع کی تکمیل کر دی - پس یہ جمع شدہ قرآن شریف حضرت ابوبکرؓ کی خاص نگرانی میں رہا - اور ان کی وفات کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کی حفاظت میں - اور آپ کی رحلت کے بعد اُم المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ رہا ؛

جمع کلام مجید میں حضرت زید کی خصوصیّت

حضرت زید بن ثابت ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مشرف باسلام ہوئے ہیں - جوان - عقیل - ذہین اور بڑے فہیم تھے - عربی خط و کتابت کے پورے ماہر تھے - یہود سے چونکہ عبرانی خط میں خط و کتابت ہوتی تھی - اور صحابہ کرام عبرانی تحریر کرنے والے حضرات موجود نہ تھے - لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو عبرانی تحریر سیکھنے کی فہمائش کی جس کو انہوں نے صرف دو ہفتوں میں سیکھ لیا - چنانچہ حدیث شریف میں ہے

قال زید بن ثابت اَمَرَنِی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَعَلَّمْتُ لَهٗ کتاب یہود وقال اِنِّیْ واللہ ما اٰمن یہود اَعلٰی کتابِی فَتَعَلَّمْتُهٗ فَلَمْ یمر لی اِلَّا نِصْفَ شہرٍ حتّٰی حَذَقْتُهٗ فَكُنْتُ اَكْتُبُ لَهٗ اِذَا كَتَبَ وَاَقْرَءُ لَهٗ اِذَا كُتِبَ اِلَيْهِ ؁

(ترجمہ) زید بن ثابت کہتے ہیں - کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا - پس میں نے آپ صلعم کے لئے یہودیوں کی کتابت سیکھی - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - بخدا مجھے اپنے مراسلات لکھوانے میں یہودیوں پر اعتبار نہیں پس مینے نصف ماہ کے عرصہ میں کتابت سیکھ لی - اور اس میں خوب ماہر ہو گیا - پس جب کوئی مراسلہ آپ صلعم نے لکھوانا ہوتا تو میں ہی لکھتا - اور جب کوئی مراسلت کہیں سے آتی - تو میں ہی پڑھکر اسے سناتا ؛ مدینہ شریف میں تشریف لانے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو کتابت وحی پہ معین فرما دیا تھا - اور اس کام کو انھوں نے نہایت امانتداری - دیانت اور احتیاط سے سرانجام دیا - کلام اللہ شریف کا مدنی النزول حصہ عموماً زید ہی کا لکھا ہوا ہے - اور وہ بہت کم آئتیں ہیں - جن کو زید کی غیر حاضری میں دوسرے کاتبوں نے لکھا ہے - اور آپ نے رسول کریم صلعم کی مجلس ہی میں قرآن مجید حفظ بھی کر لیا تھا ؛

ابن ابی داؤد لکھتے ہیں - زید بن ثابتؓ سدا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا کرتے تھے - اور وحی لکھا کرتے تھے - اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سارا کلام مجید یاد کروایا تھا - علاوہ اس کے جس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا ہے - اس سال رمضان میں دو مرتبہ (نبی کریم نے جبرائیل علیہ السّلام کے ساتھ) قرآن دوہرایا تھا - اس میں زید بن ثابتؓ شریک تھے - پس نظر موجودہ بالا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع کلام مجید کے لئے زید کو منتخب فرمایا - اور یہی انسب تھا ✦

مصاحفِ عثمانی

جنگ یمامہ میں قاریوں کی ایک جماعت کے شہید ہوجانے کے باعث جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں قرآن مجید کی جمع کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اسی طرح ملکِ عراق میں قرأت کے اختلاف کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر حضرت خذیفہ ابن الیمان شامی لشکر کے امیر کے دل میں عام اشاعتِ کلام مجید کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور انہوں نے حضرت عثمانؓ بن عفان خلیفہ الوقت کو اشاعتِ مصاحف پر متوجہ کیا۔ جس پر حضرت عثمانؓ نے ایک خاص جماعت کے اہتمام سے چند مصاحف مصحف ابی بکرؓ سے حرف بحرف نقل کرا کر بڑے بڑے اسلامی مرکزوں میں بھیجدیئے۔ جس سے آئندہ اختلاف قرأت کی اصلاح ہوگئی ؛

فتح الباری شرحِ صحیح بخاری میں ہے۔ کہ خذیفہ نے قاری ابیؓ بن کعب قاری ابن مسعود کے شاگردوں کو آپس میں جھگڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ ابیؓ کے شاگرد پڑھتے تھے۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ ۔ اور عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد پڑھتے تھے۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلْبَیْتِ ٭

اختلاف قرأت کیوں ہوا اور کب ہوا

ہجرت سے پہلے دس بارہ سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی میں جس قدر قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یقیناً وہ ایک ہی لغت اور ایک ہی طرز پر لکھا۔ اور پڑھا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب عرب کے تقریباً کل قبائل مشرف باسلام ہوگئے۔ تو اس وقت قرآن شریف کے پڑھنے میں ایک دقت درپیش آئی۔ وہ یہ تھی۔ کہ قریش کے سوائے دوسرے عرب کے قبیلے بھی اگرچہ عربی النسل اور عربی زبان ہی کے بولنے والے ہی تھے۔ مگر ان کی بول چال اور لب و لہجہ میں کہیں کہیں محاورۂ قرآن یعنے قریش کے محاورے اور ان کی روزمرہ سے اختلاف تھا۔ بعض قبائل کی لغت میں

ایسے الفاظ بھی تھے۔ جو محاورۂ قریش میں نہ تھے۔ بلکہ ان کے قائمقام دوسرے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ الغرض قبائل عرب کے مختلف لب و لہجہ کے عادی لوگ جب مسلمان ہوئے۔ اور انہیں قرآن شریف کے پڑھنے کی تکلیف دی گئی۔ (کیونکہ ہر ایک مسلمان پر صرف فرضیہ نمازوں ہی کے پڑھنے کے لیئے قرآن شریف کا کچھ نہ کچھ حصّہ یاد رکھنا لازمی اور ضروری ہے۔) تو یکایک انہیں اپنے بچپن کے پختہ لب و لہجہ کو چھوڑ کر محاورۂ قرآن یعنی قریش کی لغت میں قرآن شریف کا پڑھنا دشوار نظر آیا۔ اور حدیث العہد ہونے کے باعث انہیں کچھ نہ کچھ اپنی خودداری کا لحاظ بھی تھا۔ لہٰذا خداوند عالم نے ان لوگوں کو آسانی دی۔ اور حکم ہوا۔ کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ ۔ کہ جس محاورہ میں آسانی ہو۔ اس پر قرآن شریف پڑھ لیا کرو ؛

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں ہے۔ دنَقَلَ ابوشامۃ عَنْ بَعْضِ الشیوخ انہ قال انزل القراٰن اَوَّلاً بِلِسَانِ قُرَیْشٍ وَمَنْ جَاوَرَھُمْ مِنَ العرب الفصحاء ثُمَّ اُبِیْحَ لِلعرب اَنْ یَقْرَءُوْہُ بِلُغَاتِہِمُ الَّتِیْ جرت عَادَتُھم بِاسْتِعْمَالِھا عَلٰی اِخْتِلَافِھِمْ فِی الْاَلْفَاظِ وَالْاِعْرَابِ وَلَمْ یُکَلَّفْ اَحَدٌ مِنْھُمْ الْاِنْتِقَالَ مِنْ لُغَتِہٖ اِلٰی لغۃٍ اُخْرٰی لِلْمَشَقَّۃِ وَلِمَا کَانَ فِیْھِمْ مِن الحمیۃ ولطلب تَسْھِیْلِ فہم الْمُرَادِ وَکُلُّ ذٰلِکَ مَعَ اتِّفَاقِ الْمَعْنٰی ۔

(ترجمہ) ابوشامہ اپنے کسی بزرگ سے نقل کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے کہا۔ ابتداءً قرآن شریف کا نزول قریش کی زبان اور ان فصیح عربوں کے محاورہ پر ہوا تھا۔ جو قریش کی ہمسائگی میں رہتے تھے۔ پھر دوسرے عرب کی قوموں کے لیئے یہ اجازت دے دی گئی۔ کہ قرآن مجید اپنی اپنی لغت (محاورہ) میں جس کے استعمال کے وہ عادی ہیں۔ پڑھ لیا کریں۔ بوجہ ان کے اختلاف کے الفاظ میں اور اعراب میں۔ اور ان میں سے کسی کو مجبور نہ کیا گیا۔ کہ وہ اپنے بچپن کے پختہ محاورہ کو چھوڑ کر قریش کا محاورہ اختیار کرے۔ اس لیئے کہ ایسا کرنا ان کے لیئے دشوار تھا۔ اور ان میں اپنے اپنے محاوروں کی حمیت بھی تھی۔ اور اس سے معنوں کے سمجھنے میں اُن کے لیئے

آسانی بھی تھی۔ اور یہ سب کچھ اتفاق معنے کے ساتھ تھا۔ یعنی یہ اختلاف محاورہ ایسے اختلافات نہ تھے۔ جن سے معنوں میں کچھ بھی فرق پڑتا ہو؛

اس پر ایک شیخ نے اتنا اور اضافہ کیا ہے۔ کہ مذکورہ بالا فتوے جواز قرأت لوگوں کی اپنی خواہش کی بنا پر نہیں دیا گیا تھا۔ تاکہ ہر شخص جس لفظ کو چاہے۔ اپنی زبان کے ہم معنے لفظ سے بدل لے۔ بلکہ اس بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کی رعایت کی جاتی تھی۔ دراصل اسی اختلاف لب ولہجہ کا نام اختلافِ قرأت ہے۔ اس کا مفصل بیان ہم آگے چل کر بحثِ سبع احرف میں کریں گے؛

عجمیوں میں قرأت کا اختلاف اور اسکے مفاسد

الغرض جس قدر اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اور غیر ممالک عرب میں قرآن شریف کی تعلیم ہونے لگی۔ اسی قدر اساتذۂ قرأت کے اختلاف احرف سے عجمی قران خوانوں کی الگ الگ ٹولیاں بنتی گئیں۔ اور ساتھ ہی کشمکش بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک قاری کا شاگرد اپنے استاذ کی قرأت کے سوائے دوسروں کی قرأت کو غلط قرار دیتا۔ اور لوگوں کو اس کے ترک پر مجبور کرتا۔ جس سے بعض لوگ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی قرأت کے پیرو ہو گئے۔ ایسے ہی بعض صرف عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو صحیح جاننے لگ گئے۔ اور کچھ ابی بن کعب کی قرأت کو صحیح مانکر ان سے علیحدہ ہو گئے۔ اس اختلاف قرأت نے رفتہ رفتہ ملک میں ایک مذہبی جوش پیدا کر دیا۔ جس سے آئندہ پیدا ہونے والے فسادات اور مشکلات کو محسوس کر کے حضرت حذیفہ ابن الیمان امیر لشکر عراق نے خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ کے سامنے آ کر اس بھیانک منظر کی تفصیل بیان کی۔ اور امیر المومنین کو اس طرف متوجہ کیا۔ کہ اگر فی الفور احرف کی اصلاح نہ کی گئی۔ تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد نصاریٰ کی اناجیل کی طرح مسلمانوں میں بھی کئی قرآن رواج پا جائیں گے۔ اور پھر اس فساد کی اصلاح ناممکن ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ عرب ہی میں باعتبار وسعتِ زبان احرف کے اختلاف کے باعث اکثر نزاعیں ہوا کرتی تھیں۔ جن کے مفاسد کو مدنظر رکھ کر قبل اس کے حضرت عمرؓ بن خطاب نے بھی اپنے عہد خلافت میں غیر محاورۂ قریش پر قرآن شریف

کے پڑھنے پڑھانے کی ممانعت کر دی تھی۔ اور قرأ کے نام فرمان جاری کر دیئے تھے۔ کہ وہ محاورۂ قریش کے سوائے اور کسی محاورہ پر قرآن شریف کی تعلیم نہ دیں؛

عمرؓ بن خطاب کا فتویٰ

فتح الباری شرح بخاری میں ہے۔ کہ جب عمرؓ بن خطاب کو معلوم ہوا۔ کہ بصرہ میں عبداللہ بن مسعود لوگوں کو لغتِ ہذیل پر قرآن پڑھاتے ہیں۔ تو آپؓ نے اُن کے نام فرمان جاری کیا۔ کہ لوگوں کو ہُذَیل کی لغت پر قرآن مت پڑھاؤ۔ بلکہ صرف قریش ہی کے محاورہ پر قرآن پڑھاؤ۔ (فَاَقْرِیِٔ النَّاسَ بِلُغَۃِ قُرَیْشٍ ولا تقرئهم بلغة هُذَیلٍ الخ)

حذیفہ ابن الیمان کا واقعہ اس طرح ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ عن انس ابن مالك اِنَّ حُذیفة ابن الیمان قَدِمَ علٰے عُثْمَانَ وکان یُغَازِی الشام فی فتح ارمینة واذربایجان مع اهل العراق فَافْزَعَ حذیفة اختلافهم فی القراۃ فقال حذیفة لعثمان یا امیرالمُومِنِیْنَ ادرِكْ هٰذہِ الامّة قبل اَنْ یَخْتَلِفُوْا فے الکتاب اختلاف الیهود والنصارےٰ فارسل عثمان الی حَفْصَةَ اَنْ ارسل اِلَیْنَا بِا لصُّحُفِ ننسخها فے المَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّهَا اِلَیْكَ فَاَرْسَلَتْ بها حفصه الی عثمان۔ فامَرَ زیدَ ابن ثابتٍ وعبد اللّٰه بن زبیر وسعید ابن العاص و عبد الرحمٰن بن الحرث بن هشام فنسخوها فے المصاحف وقال عثمان لرهطِ القرشِیِّیْن الثلاثة اِذَا اختلفتم اَنْتُمْ وزید بن ثابت فی شیٔ من القرآن فاکتبوہ بلسانِ قریش فانما اُنْزِلَ بلسانهم ففعلوا حتّٰی اذا نسخوا الصحف فے المصاحف ۔ رَدَّ عثمان الصحف الے حَفْصَةَ فارسل الے کلّ اُفُقٍ بمصحفٍ ممّا نسخوا وامر بما سواہُ من القرآن فِی کُلِّ صَحِیْفَةٍ اوْمُصْحَفٍ ان یحرق؛

(ترجمہ) انس بن مالک حذیفہ ابن الیمان سے روایت کرتے ہیں۔ کہ حذیفہ بن الیمان حضرت عثمانؓ کے پاس آئے۔ اور ان دنوں وہ فتح آرمینیہ میں اہل شام سے اور آذربائجان میں اہل عراق کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ وہاں ان لوگوں کی قرأت کے

اختلاف نے حذیفہ کو گھبرایا۔ پس وہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کی۔ کہ اے امیرالمومنین! اس اُمّت کی خبر لو۔ قبل اس کے کہ وہ کتاب اللہ میں ایسا اختلاف کرنے لگیں۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اُمّ المومنین حفصہ کے پاس آدمی بھیجا۔ کہ صحیفے (یعنی مجموعہ کلام مجید جو حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں تیار ہوا تھا) بھیج دو۔ ہم اس کی نقلیں صحیفوں میں کرلیں۔ پھر اصل صحیفے آپ کے پاس واپس بھیجدیں گے۔ ام المومنین نے صحیفوں

مصاحف عثمانی کے کاتب

کو بھیجدیا۔ اور انہوں نے حضرت زید بن ثابت۔ عبداللہ بن زبیر۔ سعید بن العاص۔ عبدالرحمٰن بن الحرث بن ہشام کو حکم دیا۔ پس ان لوگوں نے مصحف ابی بکر کو صحیفوں میں نقل کرلیا۔ ان کاتبوں میں زیادہ تر اعتماد سعید بن العاص پر تھا۔ اس لئے کہ ان کا لہجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجہ سے بہت مشابہ تھا؛

کتابت مصاحف کے متعلق ہدایات

حضرت عثمانؓ نے قریش کے تینوں کاتبوں کو یہ ہدایت کی تھی۔ کہ جب کوئی لفظ مختلف القرأۃ ہو۔ اور اس کی تحریر میں تمہارا اور زید کا اختلاف واقعہ ہو۔ تو اس لفظ کو جس طرح قریش بولتے ہیں۔ لکھو۔ کیونکہ قرآن قریش ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس انہوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ جب مصاحف نقل ہوچکے۔ تو اصل صحیفے ام المومنین حفصہؓ کے پاس واپس کر دیئے گئے۔ اور ان نقل کئے ہوئے مصاحف میں سے ایک ایک مصحف اطراف ممالک میں بھیجدیا گیا۔ (یہ تمام مصاحف صرف محاورۂ قریش کی رسمِ تحریر پر لکھے گئے تھے)۔ اور حکم دیا۔ کہ اس قرآن مجید کے سوائے جس صحیفہ یا مصاحف میں قرآن لکھا ہوا ہو۔ اس کو جلا دیا جائے۔ انتہیٰ

حضرت عثمانؓ کی اس کارروائی کو بعض لوگ معائبِ عثمانؓ سے شمار کرتے ہیں۔ اور ان پر احراق قرآن کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے۔ تو اُن کا یہ فعل نہایت مستحسن ہے۔ کیونکہ ان اجزاء سے قرآن

شریف کی قرأت میں اختلافات کے بڑھنے کا خوف تھا۔ اور اکثر ان میں کے ایسے بھی تھے۔ جن کی رسمِ تحریر مصحفِ ابی بکرؓ کی رسمِ تحریر کے خلاف تھی۔ بعض میں اصل محاورۂ قرآن کے سوائے دُوسری قرأتوں کے الفاظ بھی درج تھے۔ غرض ان کی صحت قابل اطمینان نہ تھی۔ پس ایسی حالت میں جبکہ باتفاق اخیارِ اُمّت اصحابہ قرأتِ صحیحہ کے مطابق قرآن لکھ لیا گیا ہے۔ تو اس اختلافی مواد کا جلا دینا۔ قرآن اور نیز اُمّت پر احسان کرنا تھا؛

انس بن مالک فرماتے ہیں

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے کوئی مزید کام نہیں کیا۔ صرف یہی کیا۔ کہ قرأت میں لوگوں نے اختلاف پیدا کر دیئے تھے۔ انہوں نے مستند صحابہؓ کے ہاتھوں سے اسی قرآن کو (جو ابوبکرؓ نے جمع کرایا تھا) معتبر قرأت کے مطابق جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوئی۔ لکھوایا۔ چنانچہ نقل کے زمانہ میں جب کسی قرأت میں اختلاف ہوتا۔ تو بعض بعض صحابہؓ کو تین تین دن کے راستہ سے تصفیہ کے لئے بلایا جاتا تھا۔ اور مختلف فیہ آیت کی جگہ چھوڑ دی جاتی تھی۔ پھر جب معتبر ذریعہ سے وہ اختلاف طے ہو جاتا۔ تو اس آیت کو اس کی جگہ لکھ دیتے تھے؛

مصحف عثمانی میں قابل غور دو امر ہیں

اس مقام پر قابل غور دو امر ہیں۔ (۱) سبعہ احرف کی اجازت منجانب اللہ ہوئی تھی۔ اسے کیوں ترک کیا گیا۔ اور حامیان ومروجین ائمہ قرأت مثل عبداللہ بن مسعود۔ اُبَی بن کعب وہشام۔ وعلی ابن طالب۔ سب کے سب کیوں خاموش رہے؟

(۲) مصحف ابی بکرؓ لغت قریش کے سوائے دوسرے حروف پر بھی شامل تھا یا کہ نہیں؟

جواب ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس کارروائی (نقل مصاحف لغت قریش پر) میں تمام اجلّہ صحابہ کرام کا متفق ہو کر شریک ہونا۔ اس امر کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ کہ صحابہ کرام اصلیت اجازت سبعہ احرف سے پورے پورے واقف تھے۔ انہیں

یقین تھا۔ کہ یہ اجازت محض وقتی اور مقامی تھی۔ اور اس کی داعی ایک خاص ضرورت تھی یعنے یہ اجازت محض ان لوگوں کے لئے تھی۔ جو قرآن شریف کو قریش کی لغت پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اور یا انہیں اپنے اپنے محاوروں کی حمیت اس بات کی مانع تھی اب جبکہ اسلامی برکات نے ہر قسم کی مخل حمیّت کو جملہ قبائل عرب سے محو کر دیا ہے اور کلام الٰہی نے اپنے اس معجزے کو ثابت کر دیا ہے۔ کہ اس کا ہر ایک کلمہ ہر زبان پر بلا دقت جاری ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ عرب کے ہر ایک قبیلہ کا ہر ایک قاری ایک ایک کلمۂ قرآن کو ساتوں حرفوں پر بھی ادا کر سکتا ہے۔ علاوہ اس کے فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ اپنی روز افزوں ترقی کے ساتھ غیر ممالک عرب میں نہایت سرعت سے بڑھ رہا ہے۔ اور قرآن شریف ایسے لوگ پڑھ رہے ہیں۔ جن کی مادری زبان عربی نہیں۔ جنہیں قرآن شریف کا پڑھنا محاورۂ قریش و غیر محاورۂ قریش پر یکساں ہے۔ تو پھر ایسی حالت میں ان لوگوں کو خواہ مخواہ اختلاف قرأت کے الجھاؤ میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا مناسب ہے۔ کہ آئندہ قرآن شریف اسی زبان پر پڑھا جائے۔ جو قرآن شریف کی اصل زبان (لغت) ہے یعنے جس محاورہ پر وہ ابتداء سے نازل ہونا شروع ہوا۔ جو رسول عربی قرشی کی زبان ہے۔ جس پر نبی کریمؐ نے پڑھایا اور لکھوایا۔ جس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری دور (عرضۂ اخیرہ) کیا ہے۔ پس جس طرح ایک مقامی اور وقتی ضرورت سبعۂ احرف کی وسعت کی داعی تھی۔ اسی طرح اب وقتی فسادات اس کی ترک کے داعی ہیں۔ لہٰذا اجلّۂ صحابۂ کرام نے باتفاق رائے یہ تسلیم کر لیا۔ کہ قرآن شریف کی کتابت آئندہ صرف محاورۂ قریش ہی پر ہوا کرے جو قرآن مجید کا اصلی محاورہ اور اس کی لغت ہے؀

جواب امر دوم۔ نقل مصاحف عثمانی کے متعلق جتنی حدیثیں آئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اس بات کا پورا پتہ چل سکتا ہے۔ کہ مصحفِ ابی بکرؓ صرف محاورۂ قریش ہی پر جمع ہوا تھا خصوصاً اس کا متن قریشی محاورہ کے سوائے کسی اور حرف پر

شامل نہ تھا۔ اس لئے کہ اگر وہ مصحف تمام احرف یا بعض کا جامع ہوتا تو یہ امر بہت ہی مشکل تھا۔ کہ اجلۂ صحابہ کرام کتاب اللہ کے ایک حصّہ کے حذف کر دینے کو جائز قرار دیتے۔ اگر مصحف ابی بکرؓ ان تمام تحریروں کا جامع تھا۔ جنہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاص اہتمام سے لکھوایا تھا۔ تو ایک نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں صحابہ کرامؓ اسی وقت جان دے دینے پر آمادہ ہو جاتے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے حروف کے حذف کر دینے کو ہرگز گوارا نہ کرتے کیونکہ قرآن شریف کے ساتھ صحابہ کرامؓ کو ایک موانست تھی۔ اس کا ایک ایک حرف ان کے خونِ جگر سے پلا ہوا تھا۔ انہیں یقین تھا۔ کہ اس کے ایک ایک نقطہ کے نیچے برکاتِ الٰہی کا بیشمار خزانہ بھرا ہوا ہے۔ یہ ایک خاص تحفۂ کرامت ہے۔ جس کے ذریعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بدولت اس امّت کی عزت افزائی کی گئی ہے۔ ایسے یقینی الفاظ کا خواہ مخواہ حذف کر دینا انہیں کیونکر گوارا ہو سکتا تھا۔ اور ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحلت فرمائے کچھ زیادہ برس بھی نہیں گذرے تھے۔ اس وقت ایسے بہت سے صحابہ موجود تھے۔ جنہوں نے بذاتِ خود بلا واسطہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھا۔ اور اسے یاد کیا تھا۔ اور ایسے بھی بہت سے تھے۔ جن کے سامنے رسول کریمؐ نے اپنے خاص اہتمام سے آیات قرانی لکھوائی تھیں۔ کیونکہ عہد عثمانؓ عہد نبوی سے صرف تیرہ سال بعد کا زمانہ ہے۔ پس اس معاملہ میں تمام صحابہ کرامؓ کا خاموش رہنا اس امر کی صریح دلیل ہے۔ کہ مصحفِ ابی بکرؓ صرف قریش ہی کے حرف کا جامع تھا۔ اور اس میں کسی دوسرے قبیلہ کے محاورہ کا کوئی ایک حرف بھی داخل نہیں تھا۔ اور حضرت عثمانؓ کے اس حکم کتابت (جو انہوں نے کتابت مصاحف کے بارے میں کاتبان مصاحف سے فرمایا تھا۔ کہ اختلافِ کتابت میں قریشی محاورہ کی رسمِ تحریر کو ترجیح رہیگی) سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ کہ مصحفِ ابی بکرؓ میں خلاف محاورۂ قریش کوئی حرف نہیں تھا۔ اس لئے کہ ان کی تاکید "فَاِنَّہٗ نَزَلَ عَلٰی لِسَانِھِمْ" سے اسی بات کی تاکید سمجھی

الغرض حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے مصحفِ ابی بکرؓ منگوا کر بارہ کاتب نقل مصاحف پر معیّن فرمائے۔ جن کے سردار زیدؓ بن ثابت نامزد ہوئے اور اس کی نگرانی کا اہتمام بذاتِ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ذمہ لیا۔ ان کاتبوں میں تین نامور قریشی کاتب یہ تھے۔ عبداللہ بن زبیر۔ سعید بن العاص۔ عبدالرحمٰن بن الحرث بن ہشام۔ ایک روایت میں ہے۔ کہ پانچ۔ اور دوسری میں ہے۔ کہ سات مصحف نقل ہوئے۔ جو مقامات ذیل میں بھیجے گئے۔ (۱) مکہ (۲) شام (۳) بحرین (۴) یمن (۵) مصر (۶) بصرہ و کوفہ اور ایک مصحف مدینہ میں رکھا گیا۔ جس کا نام امام تھا۔

وہ مقامات جہاں مصاحفِ عثمانی بھیجے گئے

پادری ولیم میور لکھتا ہے۔ کہ وہ قرآن امام قرطبہ کی جامع مسجد میں موجود تھا۔ اور جب وہاں سلطنت اسلامی کو زوال ہوا۔ تو وہ فاس (دار الخلافہ مراکش) میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "عامل بصرہ کے پاس جو کلام مجید تھا۔ وہ اب روس کے قدیم دار الخلافہ کے کتب خانۂ اسلامی میں ہے۔ اور وہ بخارا سے لایا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی
اس کارروائی (نقل مصاحف) پر

تمام صحابہؓ میں صرف ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود کی نسبت ایک روایت میں آیا ہے۔ کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی اس کارروائی (نقل مصاحف) پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ اور وہ اس مجلس میں شریک نہیں تھے۔ جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں نقل مصاحف کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ وہ روایت یہ ہے:۔

ترمذی یہ ہے۔ اَنَّ عبد اللہ بن مسعود کَرِہَ لِزَیدِ ابن ثابت نَسْخَ المصاحف وقال یٰمَعْشَرَ المسلمین اُعزَلُ عن نسخ الکِتَابَۃِ المصاحِفِ ویتولّٰھا رَجُلٌ واللہ لَقَدْ اَسْلَمْتُ وَاِنَّہٗ لَفِیْ صُلْبِ رَجلٍ کافرٍ

(ترجمہ) - عبداللہ بن مسعود نے نسخ مصاحف پر زید بن ثابت کی ماموری کو نامناسب

سمجھ کر یہ کہا۔ اے مسلمانو! تعجب ہے۔ کہ مصاحف کی نقل پر مجھے چھوڑ کر ایک ایسے شخص کو مامور کیا گیا ہے۔ کہ واللہ میں اسلام سے مشرّف ہو چکا تھا۔ اور وہ شخص ابھی کافر باپ کی پیٹھ میں تھا۔

ابن مسعود کے اعتراض پر ایک نظر

تمام صحابہ کرامؓ میں سے صرف ایک یہی روایت ایک ہی شخص سے آئی ہے۔ اس سے بھی جو کچھ کہ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ پر یہ بات ناگوار گذری۔ کہ مصاحف کے نقل کرنے پر زید کو مامور کیا گیا۔ اور انہیں اس خدمت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ اور اپنی افضلیت اپنے اسلام کی سبقت اور اپنی درازعمری پیش کرتے ہیں۔ اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے۔ تاہم اس سے حضرت عثمانؓ کی اصل کارروائی پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ قریش کاتبوں کے ہوتے ہوئے زید بن ثابت جو مدنی ہیں۔ مصاحف کی نقل پر کیوں مامور کئے گئے۔ وہ یہ نہیں کہتے۔ اور نہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ صرف لغتِ قریش پر مصاحف کیوں نقل کرائے گئے ہیں۔ اور دوسرے حروف کی رعایت کتابت میں کیوں نہیں کی گئی۔

اس میں شک نہیں۔ کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اجلہ صحابہ کرام اور نامور اساتذۂ قرأت سے ہیں۔ زید سے عمر میں بڑے اور اسلام میں ان سے سابق بھی ہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں ایسے امور نہیں ہیں۔ کہ ان سے کتابت وحی میں زید سے افضلیت ثابت ہو سکے حضرت زید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام مدنی زندگی کے منتخب شدہ امین کاتب وحی ہیں۔ مصحفِ ابی بکرؓ کی جمع کا شرف بھی انہی کو حاصل ہے۔ پھر ایسے مقبول منجے ہوئے کاتب وحی کا انتخاب ایسے موقعہ پر نقل مصاحف کے لئے کوئی بے جا انتخاب نہیں ہے۔ بلکہ اس مبارک خدمت کے لئے یہی شخص موزوں تھے۔ حضرت عبداللہ کے اعتراض کو اگر گنجائش ہے۔ تو مشاورین جمع مصحف ابی بکرؓ پر ممکن ہے کیونکہ آپ خود اس وقت مجلس مشاورین جمع میں شامل تھے۔ جس وقت کہ حضرت ابوبکرؓ نے زید کو جمع مصحف پر مامور کیا تھا۔ لیکن اس وقت یعنے مصاحفِ عثمانی کی نقل میں

حضرت عبداللہ کو زید پر ترجیح نہیں ہوسکتی ؛

اب دیکھنا یہ ہے ۔ کہ حضرت عبداللہ کے ساتھ کسی اور صحابی کا بھی اتفاق ہے ؟ اور اُن کے اس اعتراض کے ساتھ کسی اور شخص کی آواز بھی سنائی دیتی ہے یا نہیں ؟ اور یہ کہ صحابہ کرامؓ کی طرف سے حضرت عبداللہ کو اس اعتراض پر کیا جواب ملا ؟

کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا ۔ کہ کسی صحابی نے حضرت عبداللہ کے ساتھ اس معاملہ میں اتفاق کیا ہو ۔ بعض روایات میں آیا ہے ۔ کہ انہوں نے یہ بھی کوشش کی تھی ۔ کہ اگر حضرت عثمانؓ کے لوگ صحیفے لینے چاہیں ۔ تو انہیں نہ دیں ۔ مگر اُن کی اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ؛

ابن مسعود کے اعتراض پر صحابہ کی ناراضگی

اور اجلہ صحابہ کرامؓ کی طرف سے جو کچھ عبداللہ بن مسعود کو اس کے اعتراض کے بارے میں جواب ملا ہے ۔ وہ بھی ترمذی نے اسی روایت سابق کے راوی ابن شہاب سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ۔ قَالَ بلغنی انّہٗ کَرِہَ ذٰلکَ مِنْ مَقَالَۃِ عبد اللہ بن مسعود رجالٌ من افاضل الصَّحَابَۃِ ۔

یعنے عبداللہ بن مسعود کے ان الفاظ کو جو انہوں نے زید بن ثابت کے بارے میں بولے ہیں ۔ اجلّہ صحابہ نے ناپسند کیا ۔ اور بُرا منایا ؛

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی عدم شرکت

دراصل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی عدم شرکت مجلس نقل مصاحف کا سبب یہ ہے کہ ان دنوں آپ مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے ۔ بلکہ کوفہ میں ایک جماعت کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے ۔ اگر آپ کو اس وقت بلایا جاتا ۔ تو ایک عرصہ تک نقل مصاحف کی کارروائی معرضِ التوا میں پڑی رہتی ؛

بہرحال حضرت عبداللہ بن مسعود کے اعتراض کا تعلق جو کچھ کہ ہے ۔ حضرت زید سے ہے ۔ حضرت عثمانؓ یا ان کی کارروائی سے اسے کچھ تعلق نہیں ؛

تمام نقل مصاحف میں صرف ایک لفظ میں اختلاف ہوا

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ۔ عہد عثمان میں جب مصاحف نقل کر دیئے گئے ۔ تو تمام نقل میں قریشی کاتبوں نے زید سے کہیں بھی اختلاف نہیں کیا ۔ صرف ایک لفظ (تابوت) کے لکھنے میں اختلاف واقعہ ہوا ۔ سعید اور عبدالرحمن کہتے تھے ۔ صحیح قرأت تابوت ہے ۔ اور زید اُسے (تابوۃ) کہتے تھے ۔ صحابہ سے اس کی تنقیح کی گئی ۔ آخر حضرت عثمانؓ بن عفان نے یہ فیصلہ کیا ۔ کہ قریش تابوت بولتے ہیں ۔ اس لئے یہی صحیح قرأت ہے ۔ لہٰذا وہ ایسے ہی لکھ لیا گیا ؛

اس ایک اختلاف کے سوائے اور کسی اختلاف کا تذکرہ ذخیرۂ احادیث میں نہیں پایا جاتا ۔ اس حدیث سے یہ بات بوضاحت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے ۔ کہ مصحف ابی بکرؓ صرف محاورۂ قریش ہی پر لکھا ہوا تھا ۔ اور اس میں کسی دوسرے محاورہ کا کوئی ایک لفظ بھی شامل نہیں تھا ۔ ورنہ اس کا تذکرہ روایات میں ضرور پایا جاتا ؛

مصحف ابی بکرؓ یا مصاحف عثمانی کے سوائے تین اور تالیفیں

روایات میں ایسی تین تالیفوں کا ذکر آتا ہے ۔ جن کی سورتوں کی ترتیب مصحف امام کی ترتیب سُوَر سے مختلف بتائی جاتی ہے ۔ وہ تین تالیفیں یہ ہیں (۱) تالیف عبداللہ بن مسعود (۲) تالیف اُبَی بن کعب ۔ (۳) تالیف علی بن ابی طالب ۔ اب ہم ہر ایک تالیف کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہیں :-

تالیف عبداللہ بن مسعود

(۱) تالیف عبداللہ بن مسعود ۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں ۔ کہ ہر آیت نازل ہوتے ہی تحریر میں ضبط کر لی جاتی تھی ۔ اور دوسرے حاضرین صحابہ میں سے کوئی اسے یاد کر لیتا ۔ اور کوئی اپنے طور پر اُسے لکھ بھی لیتا تھا ۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود بھی اپنے طور پر آیات و سُوَر جمع کرتے رہتے تھے ۔ پھر جب آپ نے سورتوں کو سلسلہ وار جمع کیا ہے ۔ تو اس میں اس ترتیب سُوَر کا لحاظ نہیں کیا جس پر حفاظ صحابہ کا تعامل تھا ۔ اور جس ترتیب پر وہ مصحفِ ابی بکرؓ میں جمع ہوئے ہیں ۔

ہم یہ نہیں کہ سکتے ۔ کہ عبداللہ بن مسعود اس ترتیب سُوَر سے ناواقف تھے ۔ جس پر عام صحابہ کا تعامل تھا ۔ اور جس پر وہ خود بھی قرآن شریف دُہرایا کرتے تھے ۔ کیونکہ آپ نے ستر سورتیں بلاواسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد کی تھیں ۔ اور یہ کہ اس قسم کی تالیف سے ان کا کیا مطلب تھا ۔ قیاس سے یہ پتہ چلتا ہے ۔ کہ انہوں نے اس ترتیب پر سورتوں کو جمع کیا ہے ۔ جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تہجّد وغیرہ نمازوں میں سورتوں کو پڑھا ہے ۔ چنانچہ اپنی تالیف میں انہوں نے ان بیس سورتوں کو ویسے ہی ترتیب وار لکھا ہے ۔ جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تہجّد کی نماز میں تلاوت فرمایا کرتے تھے ۔ ان میں دو سُورتیں حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں ۔ اور اٹھارہ قرآن شریف کی آخری منزل کی چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں ۔ جن کو مفصّل کہتے ہیں ۔ یہ مفصّل سُورتیں سورۂ قٓ سے شروع ہوتی ہیں ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا ۔ کہ اکثر اوقات تہجد کی نماز میں یعنے تہجّد کی دس رکعتوں میں سے ہر ایک رکعت میں دو دو سُورتیں ملا کر تلاوت فرمایا کرتے تھے ۔ بہرحال اس سے ان کا کچھ ہی مطلوب ہو ۔ اُن کی تالیف میں سورتوں کی ترتیب مصحف امام کی ترتیب سُوَر سے مختلف ہے ۔ علاوہ اس کے ان کی تالیف میں سُورۃ فاتحہ و مُعَوِّذتین بھی نہیں ہیں ۔ چنانچہ روایت احمد میں ہے ۔ "اَنَّ عبدَ اللهِ بنَ مسعودٍ لا یَکتُبُ الْمُعَوِّذَتینِ فی مُصْحَفِہٖ ۔" کہ عبداللہ بن مسعود اپنے مصحف میں معوذتین کو نہیں لکھا کرتے تھے دوسری روایت میں ہے ۔ کانَ عبدُ اللهِ بنُ مسعودٍ یَحُکُّ الْمُعَوِّذَتَینِ عَنْ مَصَاحِفِہٖ وَیَقُوْلُ اِنَّہُمَا لیسَا مِنْ کتابِ اللهِ ۔ کہ وہ معوذتین کو اپنے مصاحف میں سے چھیل ڈالتے تھے ۔ اور کہتے تھے ۔ یہ دونوں (معوذتین) کتاب اللہ سے نہیں ہیں ۔ حالانکہ تمام صحابہؓ سورہ فاتحہ اور معوذتین کے جزوِ قرآن ہونے پر یقین رکھتے ہیں ۔ اور کوئی ایک شخص بھی ان کے ساتھ اس بارے میں متفق نہیں ہوا ؛

قاضی باقلانی ابن مسعود کی اس کارروائی کے متعلق لکھتے ہیں ۔ کہ ابن مسعود نے

معوذتین کے جزوِ قرآن ہونے سے انکار نہیں کیا ۔ بلکہ یہی کہا ۔ کہ ان کو قرآن کے اندر نہ لکھا جائے ۔ بہرحال تالیف ابن مسعود ایک شخص کی ذاتی رائے کا نمونہ ہے ۔ اور وہ مصحف امام فاضل ترین جماعت صحابہ کی متفقہ کوشش اور ان کی جانفشانی تحقیق کا تیار کیا ہوا مصحف ہے ۔ لہٰذا ایسی تالیف مصحف ابی بکرؓ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ؛

تالیف اُبَی بن کعب دوسری تالیف مصحف اُبَیّ بن کعب ۔ اس تالیف اور مصحف امام میں بلحاظ ترتیب آیات و سُوَر چنداں اختلاف نہیں ۔ فرق یہ ہے ۔ کہ مصحف اُبَیّ میں دو سورتیں حُفْد و خُلْع کے نام سے زائد درج ہیں ۔ اور مصحف امام میں یہ دونو نہیں ۔ حُفْد اور خُلْع دعائے قنوت کے دو جملے ہیں ۔ یہ وہ دعائیہ دو جملے ہیں ۔ جن کو مسلمان ہر روز نماز رات کی نماز وتر میں پڑھا کرتے ہیں ۔ یہ دُعا خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سکھائی ۔ خود بھی پڑھی ۔ اور صحابہ کو بھی وتر کی نماز میں پڑھنے کی ہدایت فرمائی ؛

حُفْد و خُلَع دعائے قنوت کے دو جملے ہیں ۔ اور وہ اس طرح ہیں : ۔

خلع اوّل	اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ وَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَیْكَ وَنُثْنِیْ عَلَیْكَ الْخَیْرَ وَ نَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَ نَتْرُكُ مَنْ یَّفْجُرُكَ ط	اے اللہ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں ۔ اور تیری ہی حفاظت طلب کرتے ہیں ۔ اور تجھ ہی پر ایمان لاتے ہیں ۔ اور تیرے ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔ اور تیری نیک ثنا کرتے ہیں ۔ اور ہم تیرا شکر کرتے ہیں ۔ اور تیری ناشکری نہیں کرتے ۔ اور جو تیری نافرمانی کرتا ہے ۔ ہم اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں ۔ اور اُسے چھوڑتے ہیں ؛
حفد دوم	اَللّٰھُمَّ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْكَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ	اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تیرے لئے نماز پڑھتے ہیں ۔ اور سجدہ کرتے ہیں ۔ اور تیری طرف ہی بھاگ کر آتے ہیں ۔ اور تیری خدمت

وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ ط	میں حاضر ہیں ۔ اور تیری رحمت کی امید رکھتے ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں ۔ کیونکہ تیرا عذاب کافروں کو پانے والا ہے ۔

الغرض اُدھر بیشمار صحابہ کرامؓ کی شہادت موجود ہے ۔ کہ حفد و خلع دعائیہ جملے ہیں اور جزو کلام مجید نہیں ۔ ادھر ایک تنہا حضرت اُبَیّ ان کو جزو قرآن مجید قرار دے کر دو سورتیں بتاتے ہیں ۔ لہذا اتنے صحابہ کے برخلاف یہ نہیں کہا جاسکتا ۔ کہ وہ سب غلطی پر ہوں ۔ بلکہ اس میں حضرت اُبیّ کے خیال ہی کی غلطی ثابت ہوتی ہے

مصحف علیؓ بن ابی طالب

(۳) تیسری تالیف ۔ مصحف علیؓ بن ابی طالب ۔ ایک حدیث میں اس بات کا پتہ چلتا ہے ۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے بھی اپنے طور پر ایک مصحف لکھا ہے ۔ روایت اس طرح پر ہے ۔ کہ عہد ابوبکر رضی اللہ عنہ میں حضرت ابوبکرؓ سے کہا گیا ۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کسی ناراضگی کے باعث دربارِ خلافت میں تشریف فرما نہیں ہوتے ۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو بلوا بھیجا ۔ جب حضرت علیؓ آئے ۔ اور ان سے ماجرا پوچھا گیا ۔ تو آپ نے فرمایا " رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد میں نے عہد کرلیا ہے ۔ کہ میں اس وقت تک آرام نہ کرونگا ۔ بروایت دیگر گھر سے باہر نہ نکلونگا ۔ جب تک کہ میں قرآن جمع نہ کرلوں گا ۔ حضرت صدیق رضؓ نے فرمایا ۔ یہ اچھا کام ہے ۔ لیکن اس کے بعد کوئی تالیف مصحفِ علیؓ کے نام سے کسی عہد میں قوم کے سامنے پیش نہیں ہوئی ۔ اور نہ ہی خود حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے کسی مجلس میں یہ ظاہر فرمایا ہے ۔ کہ میں نے بھی کوئی مصحف جمع کیا ہے ۔ اگر آپ نے کوئی مصحف لکھا ہوتا ۔ تو اس کے اظہار کا پہلا موقعہ مصحف ابی بکرؓ کی جمع کا وقت تھا ۔ جبکہ بحکم خلیفۃ الوقت تمام صحابہؓ سے وہ صحائف جمع کئے گئے تھے ۔ جن میں متفرق طور پر آئتیں اور سورتیں لکھی ہوئی تھیں ۔ اور اس اہتمام میں خود حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بھی شریک تھے ۔ کسی روایت میں ذرا برابر بھی اس مضمون کا پتہ چلتا

نہیں ۔ جس میں حضرت علیؓ کی طرف سے جمع مصحفِ صدیقؓ کے وقت ناراضگی یا اختلاف کا ذکر ہو ۔ پھر دُوسرا موقعہ اس کے اظہار کا عہد عثمان تھا ۔ جس میں قرآن شریف کے بہت سے نسخے لکھوائے گئے ۔ اور اطرافِ ممالک میں بھیجکر یہ حکم دیا گیا کہ جملہ اہل اسلام مصحفِ امام کی پیروی کریں ۔ حالانکہ اس وقت بھی حضرت علیؓ مجلس جامع قرآن میں شریک رہے ہیں ۔ اور آپ نے عام صحابہؓ سے کوئی مخالفت ظاہر نہیں کی ۔ اس کے بعد اس کے اظہار کا تیسرا موقعہ عہد علوی تھا ۔ جس میں خود حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اُمّت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تھی ۔ اور مخالفانِ خلافت سے جنگ کرنے میں اپنی ساری طاقت خرچ کی تھی ۔ اگر آپ کے پاس کوئی مصحف کامل ہوتا ۔ جو مصحف عثمانی کے خلاف تھا ۔ تو اس کی اشاعت ایسے وقت میں لازمی اور ضروری تھی ۔ ممکن ہے ۔ کہ بعض خود پسند آپ کے (مصحف علوی) کی تکذیب کرتے ۔ مگر آپ کا کام اس کے اظہار کا تھا ۔ کم سے کم اتنا تو ضرور کرتے ۔ کہ حضرت عثمانؓ کی طرح مصحف حفصہ کی نقل کراکر چند نسخے شائع کردیتے ۔ لوگ اس پر عمل کرتے ۔ خواہ نہ کرتے لیکن اس کے برخلاف ایسے وقت میں بھی آپ نے کسی مصحف کو ظاہر نہیں کیا ۔ نہ ہی مصحف عثمانی کی تکذیب کی ۔ بلکہ خود بھی اسی مصحفِ عثمانی پر عمل کیا ۔ اور لوگوں کو بھی اسی مصحف پر عمل کرنے کی ہدایت کی ۔ اس کے بعد حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ نے بھی اس کو ظاہر نہیں کیا ۔

ان واقعات پر نظر ڈالنے سے صراحتہً معلوم ہوتا ہے ۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے کوئی تالیف نہیں فرمائی ۔ ہاں یہ ممکن ہے ۔ کہ آپ کے دل میں جمع مصحف کا خیال پیدا ہوا ہو ۔ اور اس پر کچھ لکھا بھی ہو ۔ لیکن ادھر جب تمام صحابہؓ نے اپنی متفقہ کوشش سے جمع مصحف کا کام شروع کردیا ۔ اور ہر ایک آیت و سُورت کی بکمال دقت نظر تنقید و تنقیح ہونے لگی ۔ تحریر و حفظ آیات پر شہادتیں گذرنے لگیں ۔ اور اجلّہ صحابہ کرام کی ایک سرگرم جماعت (جس کے ممبر خود حضرت علیؓ بھی تھے) کے اہتمام سے مصحف میں ایک ایک آیت جمع ہونے لگی ۔ تو ضرور ہے ۔ کہ آپ نے جمع مصحف کا کام ملتوی کردیا ہوگا ۔

فتح الباری میں ایک روایت ہے۔کہ "عَنْ عَبْدِ خَیْرٍ سَمِعْتُ عَلِیًّا یَقُوْلُ اعظم النّاس فِی الْمَصَاحِفِ اجراً اَبُوْبکر رَحْمَۃُ اللّٰہ علی ابی بکر ھُوَ اَوَّلُ مِنْ جَمَعَ کِتَابَ اللّٰہ" یعنے قرآن شریف کے جمع کرنے والوں میں سب سے زیادہ اور بڑے درجے والے حضرت ابوبکرؓ ہیں۔ اللہ کی ان پر رحمت ہو۔ وہی سب سے پہلے شخص ہیں۔جنہوں نے قرآن شریف جمع کیا۔

اس کے بعد حبّ علیؓ وبُغض معاویہ کی جب آگ بھڑک اٹھی۔ تو بعض لوگ حضرت عثمانؓ کے اس فعل کے متعلق کچھ کچھ کہنے لگ گئے تھے۔لیکن جب حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہٗ نے سُنا۔ اور آپ کو کیفیت واقعہ معلوم ہوئی۔ تو فرمایا۔ ابن داؤد لکھتے ہیں :۔

قَالَ عَلِیٌّ لَا تَقُوْلُوْا فِیْ عُثْمَانَ اِلَّا خَیْرًا فَوَاللّٰہِ مَا فَعَلَ الَّذِیْ فِی المصاحف اِلَّا عَنْ مَلَاءٍ مِّنَّا۔ قَالَ مَا تَقُوْلُوْنَ فِیْ ھٰذِہِ الْقِرَاءَۃِ فَقَدْ بَلَغَنِیْ اَنَّ بَعْضَھُمْ یَقُوْلُ اِنَّ قِرَاءَتِیْ خَیْرٌ مِّنْ قِرَاءَتِكَ وَھٰذَا یَکَادُ اَنْ یَکُوْنَ کُفْرًا قُلْنَا فَمَا تَرٰی قَالَ اَرٰی اَنْ نَجْمَعَ النَّاسَ عَلٰی مُصْحَفٍ وَاحِدٍ فَلَا تَکُوْنُ فِرْقَۃٌ وَّاخْتِلَافٌ قُلْنَا نِعْمَ مَا رَاَیْتَ۔

ابن داؤد سوید بن غفلہ سے روایت کرتا ہے۔ اس نے کہا۔علی کرم اللہ وجہہٗ نے کہا عثمانؓ کے بارے میں کلمۂ خیر کے سوائے کچھ نہ کہو۔واللہ انہوں نے جو کچھ مصاحف کے بارے میں کیا۔ وہ ہماری ایک معتبر کثیر جماعت کے مشورہ سے کیا ہے۔ انہوں نے ہم سے کہا۔ تم لوگ اس قراۃ میں کیا کہتے ہو۔ میں نے سنا ہے۔ کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔میری قرأت تمہاری قرأت سے اچھی ہے۔ اور یہ بات قریب قریب کفر کے ہے۔ ہم نے کہا۔ پھر تمہاری کیا مرضی ہے؟ عثمانؓ نے جواب دیا۔یہ مناسب ہے۔کہ تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کردیا جائے۔ تاکہ پھر کوئی فرقہ و اختلاف نہ رہے۔ہم نے کہا۔تمہاری رائے بہت عمدہ ہے؛

ہمارے دعوے کے ثبوت میں یہی ایک ہی روایت کافی ہے۔ باقی حضرات

شیعہ کے خیالات کی تردید میں ہم پادری ولیم میور کے فیصلہ کی چند سطریں نقل کردینا مناسب سمجھتے ہیں؛

مصحف عثمانؓ کے متعلق پادری ولیم میور کی رائے

پادری میور اپنی کتاب لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لکھتا ہے :۔

اس بات کو تسلیم کرکے کہ ہمارے ہاتھوں میں بلا تغیر و تبدّل وہی نسخہ موجود ہے۔جو حضرت عثمانؓ نے شائع کرایا تھا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔کہ آیا یہ نسخہ قرآن کا زید والے قرآن کے ساتھ سوائے خفیف اصلاحات کے بالکل مطابق ہے۔ اس بات کے ماننے کے لئے پُورے پُورے دلائل موجود ہیں۔کہ واقعہ میں ایسا ہی ہے۔کسی پرانی روایت اور معتبر حدیث سے ذرہ بھر شک کرنے کی وجہ پیدا نہیں ہوتی۔کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے دعوے کی تائید میں قرآن میں ایک ذرہ برابر تصرف کیا ہو۔ اس میں شک نہیں۔کہ متاخرین شیعہ نے غلطی سے یہ بات گھڑ رکھی ہے۔کہ حضرت عثمانؓ نے بعض سورتیں اور بعض آئتیں عمداً درج قرآن نہیں کرنے دی تھیں۔اور وہ سورتیں اور آئتیں ایسی تھیں۔ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے دعاوی کی مؤید تھیں۔لیکن شیعوں کی یہ رائے بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ جب حضرت عثمانؓ کا نسخہ قرآن تیار ہوا۔ تو علیؓ کے پیروؤں اور بنو امیّہ میں ابھی کوئی ظاہری اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اخوۃ و وحدۃ اسلامی میں کوئی فرق واقعہ نہیں ہوا تھا۔ (حضرت) علیؓ کے دعاوی ابھی تک منصۂ شہود میں آئے ہی نہ تھے۔کوئی ایسی غرض خاص طور پر نظر نہیں آتی۔جس نے ایسے وقت میں عثمانؓ کو ایسے مکروہ اور سیاہ گناہ کے ارتکاب پر آمادہ کیا ہو۔جو مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔پھر سوائے اس کے جب عثمانؓ نے قرآن جمع کرکے اس کو مستند طور پر شائع کیا۔ تو وہ ایسا زمانہ تھا۔ کہ جبکہ ابھی ہزارہا ایسے لوگ زندہ موجود تھے۔جنہوں نے وقت نزول سے ہی قرآن کو سنکر حفظ کرلیا ہوا تھا۔ اور اگر کوئی سُورت یا آیت ایسی ہوتی۔جو علیؓ کی دعاوی کی مؤید تھی۔ تو ضرور تھا۔کہ وہ ہزارہا لوگوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتی بخصوص جو علیؓ کے ساتھ خاص اخلاص و تعلق رکھتے تھے۔یہ دونو ایسی باتیں تھیں۔کہ ان سے اصل قرآن میں کسی قسم کے تصرّف و تغیرّ

کا دخل پانا ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر اس کے علاوہ (حضرت عثمانؓ کے فوت ہوتے ہی (حضرت) علیؓ کے خیرخواہوں کی جماعت کا غلبہ ہوگیا۔ اور ایسی آزاد طاقت حاصل کرلی۔ کہ ان کو خلیفہ بنا دینے میں کامیاب ہوگئی۔ کیا یہ گمان صحیح ہوسکتا ہے۔ کہ جب اس طرح کی ان کو دولت و قوت مل گئی تھی۔ تو اس وقت وہ اس ناقص قرآن شریف کے رواج کی اجازت دے رکھتے۔ اور ناقص بھی ایسا کہ ان کے اپنے پیشوا علیؓ کے دعووں کی آیات و سوَر کے اندراج سے خالی؛

لیکن ہم کہتے ہیں۔ کہ وہ لوگ بھی اس قرآن شریف کو بلا قیل وقال ہمیشہ استعمال کرتے رہے۔ اور ان کے مخالف بھی اسی قرآن کو پڑھتے رہے اور خفیف سے خفیف اعتراض بھی اس کے متعلق نہیں کیا؛ انتہی (از لائف آف محمدؐ)

متقدمین شیعہ لیکن اس موقعہ پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ حضرات شیعہ کی ساری جماعت اس قسم کا اعتقاد نہیں رکھتی۔ کہ قرآن شریف کے کچھ حصّے درج مصاحف ہونے سے رہ گئے ہیں بلکہ متقدمین شیعہ کی ایک بہت بڑی جماعت اس کے برخلاف یہ اعتقاد رکھتی ہے۔ کہ قرآن شریف ہر قسم کی آلائش تصرف و تغیر و تبدل سے ہمیشہ پاک صاف رہا ہے۔ اور آئندہ بھی رہیگا؛

ملا محسن صاحب اپنی تفسیر صافی صفحہ ۱۴ میں لکھتے ہیں۔ (یہ تفسیر آجکل شیعہ مدارس میں پڑھائی جاتی ہے)

قد روای جماعةٌ من اصحابنا وقوم من الحشوية العامة ان فی القرآن تغيراً ونقصاناً والصحيح من مذهب اصحابنا خلافه وبلغت حدّ ألم نبلغه فی ما ذکرناه ان القرآن معجزةُ النبوة ومأخذ العلوم الشرعية والاحکام الدينية وعلماء المسلمين قد بلغوا فی حفظه وحمايته الغاية حتی عرفوا کل شیٔ اختلف فيه من اعرابه وآياته

ہمارے دوستوں کی ایک جماعت اور عوام حشویہ نے یہ روایت کی ہے۔ کہ قرآن شریف میں تغیر اور نقصان ہے لیکن صحیح مذہب ہمارے اصحاب کا اس کے خلاف ہے۔ اور نیز ان لوگوں کی رائے اس حد تک پہنچی ہے کہ ہم اس کو بیان نہیں کرسکتے۔ اور اصل بات یہ ہے۔ کہ قرآن شریف نبوّت کا اعجاز اور علوم شرعیہ کا ماخذ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے اور علماء اسلام نے یہانتک اسکی حفاظت اور نگرانی کی ہے۔ کہ انہوں نے ہر چیز میں جس

وحی وفه وقراءته

فکيف يجوز ان يکون مغيراً ومنقوصاً مع العناية الصادقة والضبط الشديد

میں اعراب قرأت احرف اور آیات کے بارہ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ عرفان تام اور واقفیت عام پیدا کرلی ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے۔ کہ ضبط شدید اور حفاظت صحیحہ کی موجودگی میں کسی قسم کا تغیر یا کمی ہونے پائی ہو؛

قاضی نور اللہ شوستری مصائب النواصب میں لکھتے ہیں

ما نُسِبَ الی شيعة الامامية التغير فی القرآن ليس مما قال به جمهور الامامية انما قال به شرذمةٌ قليلة لا اعتداد بهم فيما بينهم

شیعہ امامیہ کی طرف یہ بات جو منسوب ہے۔ کہ وہ کہتے ہیں۔ کہ قرآن میں تغیر ہوا ہے جمہور امامیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا قائل ایک چھوٹا گروہ ہے۔ جو کسی شمار میں نہیں؛

شارح کافی علامہ محمد بن الحسن الحر العاملی کا جو فرقہ امامیہ میں اعلےٰ محدث ہیں قول نقل کرتے ہیں:۔

ہر کسے کہ تتبع آثار و تفحص تواریخ و آثار نمودہ باشد بعلم یقین مے داند۔ کہ قرآن در غائت و اعلےٰ درجۂ تواتر بودہ و آلاف صحابہ حفظ و نقل مے کردند۔ آنرا و در عہد رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم مجموع و مولف بود (شرح کافی ملا صادق جلد ۲ مطبوعہ قسطنطنیہ)

علّامہ طبرسی مجمع البیان میں شریف مرتضےٰ علم الہدیٰ کا قول نقل کرتے ہیں:۔

ان القرآن کان علےٰ عهد رسول الله صلے الله عليه وسلم مجموعاً مؤلفاً علی ما هو عليه الان واستدلّ علیٰ ذالك۔ یعنے قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسی طور پر مکمل و مرتب تھا۔ جس طرح کہ وہ اب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ اس پر بہت سے دلائل لکھنے کے بعد پھر لکھتے ہیں:۔

وانّ خالف ذالك من الامامية والحشوية لا يعتدّ بخلافهم لان الخلاف مضافٌ الی قوم من اصحب الحديث نقلوا

امامیہ و حشویہ سے جن لوگوں نے اس کے خلاف کہا۔ وہ کسی شمار و قطار میں نہیں۔ کیونکہ یہ اختلاف ان چند اصحاب کی طرف منسوب ہے۔ جنہوں نے

اخباراً ضعیفۃً ظنوا صحتھا۔ (مجمع البیان مطبوعہ ایران)	ضعیف روائتیں نقل کرکے ان کو صحیح مان لیا؛

اس کے سوائے اور بھی بہت سے مستند علمائے شیعہ کے اقوال تکمیل قرآن کے متعلق ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مگر بخوف طوالت ہم انہیں درج نہیں کرتے؛

تناسب آیات و سُوَر

ہم اوپر ذکر کرآئے ہیں۔ کہ آیات و سُوَر کی ترتیب توقیفی ہے۔ ہر ایک آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے موافق خاص اہتمام سے اپنے اپنے محل پر لکھی گئی ہے۔ اسی طرح ایک سورت کے بعد دوسری صورت کا محل وموقعہ بھی ارشاد مبارک ہی کے ساتھ مقرر ومعیّن ہوا ہے۔ عرضۂ اخیرہ میں جب دو مرتبہ قرآن دوہرایا گیا۔ تو اسی ترتیب آیات و سُوَر پر دوہرایا گیا ہے۔ جس پر آجکل لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے؛

اب رہی یہ بات کہ آئتیں آپس میں مرتبط اور منتسق بھی ہیں یا نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ قرآن کی آئتیں اور سورتیں چونکہ مختلف واقعات وحالات کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ اس لئے ان میں باہمی ربط نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر یہ خیال لغو ہے۔ کلام کی رفعت بلاغت کا انحصار مخاطب کے اقتضائے حالت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور خصوص قرآن کا اعلےٰ مقصد یہ ہے۔ کہ وہ اخلاص وتزکیۂ نفس کے مضامین میں مخاطب کو ہمہ تن محو کرنا چاہتا ہے۔ تکمیل فطرت انسانی کے احکام پیشینگوئیاں قرون سابقہ وامم ماضیہ کے حالات علوم وحکمت کی دقیق ونازک باتیں۔ مذہبی۔ تمدنی۔ ملکی۔ تجارتی دیوانی۔ فوجداری وغیرہ وغیرہ کے ضابطے۔ روحانی نجات۔ صحت جسمانی۔ جماعت وافراد کے حقوق وغیرہ وغیرہ سب کے سب اس قدر مضامین قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ کہ اگر کوئی انسان تمام مضامین کو ضبط کرنا چاہیے۔ تو قرآن جیسی دس ضخیم کتابوں میں بھی ضبط نہ ہوسکے گا۔ لیکن قرآن میں یہ سب مضامین نہایت عمدگی سے بیان ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ اسقدر موجز ومختصر ہے۔ کہ کسی کلام کا اس کے برابر مختصر ہو کر ایسے مضامین کا

اداکرنا صرف ناممکن ہی نہیں۔ بلکہ محال ہے۔ اس میں کوئی زاید بات بیان نہیں ہوئی اور ضروری باتیں بھی رمز وکنایہ میں عموماً ادا ہوئی ہیں۔ جس طرح اس کا ظاہر مضامین حسنہ سے لبریز ہے۔ ایسے ہی اس کا باطن لطائف معانی سے مملو ہے۔ لہٰذا اس کی آیات و سُوَر کا تناسب معلوم کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بڑا تعجب ہے کہ خالق کلمہ وکلام کا کلام ہو۔ اور اس میں تناسب وارتباط واتساق نہ پایا جائے۔ اور اس کی نسبت یہ کہا جائے۔ یہ کلام غیر مرتبط ہے۔ اور کہنے والے بھی کون، وہ جنہیں اپنی روزمرّہ میں بھی کافی دسترس نہیں۔ علاّمہ ابن عربی لکھتے ہیں۔ "میرا دعوےٰ ہے۔ کہ قرآن کریم کی تمام آئتیں مسلسل اور ایک دوسرے سے مُرتبط ومنتظم ہیں۔ لیکن چونکہ جمہور اس علم کی قدر نہ کرے گی۔ اس لئے اس کا لطف خود میں ہی اٹھالیتا ہوں۔ اور اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان رکھتا ہوں۔ محققین علماؤں نے اس مضمون پر بہت کچھ لکھا ہے۔ فمن شاء فلیرجع الیہ ٭

سَبْعہ اَحْرُف

تاج المصادر میں ہے۔ احرف جمع ہے۔ واحد اس کا حرف بمعنے محاورہ۔ لغت (طرز ادائے کلام) فالمراد بسبعۃ احرفٍ۔ سبع لغاتٍ من لغاتِ العربِ یعنے قرآن شریف نازل ہوا۔ سات لغتوں میں لغات عرب سے؛

فتح الباری۔ نقل ابوشامۃ عن بعضِ الشیوخ انہ قال اُنزِلَ القراٰن اولاً بلسانِ قریشٍ ومَنْ جاوَرَھُمْ مِنَ العربِ الفُصَحَاءِ۔ ثمّ ابیح للعرب اَنْ یَقْرءوہ بلُغاتِھِمُ الّتِیْ جرت عادتہم باِسْتِعمالِھا علےٰ اختلافھم فی الالفاظ والاعرابِ ولم یُکلّف اَحَدٌ مِنھُم	ابوشامہ اپنے کسی بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اول قرآن شریف کا نزول زبان قریش اور ان فصیح عربوں کی زبان میں ہوا تھا جو انکی ہمسائگی میں رہتے تھے۔ پھر دوسری عرب قوموں کو یہ اجازت دیگئی۔ کہ وہ اسے اپنی لغات میں یعنی ان محاوروں میں جنکے استعمال کے وہ عادی ہیں پڑھ لیا کریں۔ بوجہ ان کے اختلاف کے الفاظ میں اور اعراب

الاستقال من لغتهِ الی لغتهٍ اُخریٰ للمشقةِ ولِما کان فیہم الحمیۃ وطلب تسہیل فہم المراد کل ذالک مع اتفاق المعنیٰ ؁

میں اور ان میں سے کسی کو اسبات پر مجبور نہ کیا گیا۔ کہ وہ اپنے محاورونکو چھوڑکر دوسرے کا محاورہ اختیار کرے کہ ایسا کرنا ان کیلئے دشوار تھا۔ اور ان میں اپنے اپنے محاورونکی حمیت بھی تھی اور اس سے فہم معنی میں بھی آسانی تھی۔ اور یہ سب کچھ اتفاق معنے کے ساتھ تھا؁

یعنے یہ اختلاف محاورہ ان کے ایسے نہ تھے۔ جن سے معنوں میں کچھ بھی فرق پڑتا ہو۔ انتہی

(۲) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال اقرءنی جبریل علے حرفٍ فراجعتہ فلم ازل استزیدہ ویزیدنی حتےٰ انتہی الی سبعۃ احرفٍ ۔ (بخاری)

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جبریلؑ نے مجھے قرآن ایک حرف پر پڑھایا۔ مینے اس سے مراجعت کی (بار بار دوہرایا) کہ زیادہ حروف میں پڑھے۔ پس وہ تعداد کو بڑھاتا گیا۔ یہاں تک کہ سات پر پہنچ گیا؁

مسلم میں بھی یہی حدیث کچھ زیادتی کے ساتھ آئی ہے۔ قال ابن شہاب بلغنی تلک السبعۃ الاحرف انما ھی فی الامر یکون واحداً لا یختلف فے الحلال والحرام ۔ یعنے ابن شہاب نے کہا۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے۔ کہ یہ سات حروف ایسے امر میں ہیں۔ جو ایک ہی ہے۔ اور اس سے حلال وحرام میں کوئی فرق نہیں آتا؁

(۳) عن ابن مسعودٍ قال سمعت رجلاً یقرء وسمعتُ النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرء خلافہا فجئت بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرتہ فعرفت فی وجہہ الکراھۃ ۔ فقال کلاکُما

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں سینے ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور طرح پر پڑھتا سنا تھا۔ پس میں اسکو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا۔ اور خبر دی۔ مینے دیکھا۔ کہ آپ کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار ہیں۔

محسنٌ فلا تختلفوا۔ فانّ من کان قبلکم اختلفوا فہلکُوا ۔ (بخاری)

آپ نے فرمایا تم دونو ٹھیک پڑھتے ہو۔ اختلاف مت کرو کیونکہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں انہوں نے اختلاف کیا اور ہلاک ہوگئے؁

(۴) عن اُبیّ بن کعب قال کنت فی المسجد فدخل رجلٌ یصلّی فقرء قرءۃً انکرتہا علیہ ثم دخل اخرٌ فقرء قرءۃً سوای قراۃ صاحبہ فلمّا قضینا الصّلاۃ دخلنا جمیعاً علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ فقلت ان ھذا اقرءَ قراۃً انکرتہا علیہ ودخل اخرٌ فقرء سوائے قراۃ صاحبہ فامرھما النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقرءا فحسن شانہما ۔ فسقطَ فی نفسی من التکذیب ولا اذکنت فی الجاھلیۃ فلما رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماقد غشینی ضربَ فی صدری ففضتُ عرقاً وکانّما انظر الی اللہ فرقا فقال لی یا اُبیّ اُرسل الیّ ان اقرأ القران علے حرفٍ فرددت الیہ ان ھوِّن علے امتی فردّ الی الثانیۃ اقرأہٗ علی حرفین فرددت الیہ ان ھوّن علے اُمّتی فردّ الی الثالثۃ اقرأہٗ علے سبعۃِ احرفٍ ۔ (مسلم)

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں مسجد میں تھا۔ اور ایک آدمی آکر نماز پڑھنے لگا۔ اس نے قرأت پڑھی جسپر مینے اعتراض کی پھر دوسرا آیا اس نے پہلے سے بھی اختلاف کے ساتھ قرأت پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوکر ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں حاضر ہوئے۔ مینے عرض کیا کہ اس شخص نے ایک قرأت پڑھی ہے۔ جسپر میں نے اعتراض کیا ہے پھر دوسرا شخص آیا۔ اس نے بھی اس سے مختلف قرأت پڑھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونو کو حکم دیا انہوں نے پڑھ سنایا۔ اور آپؐ نے ان دونو کی قرأت پسند فرمائی اسپر میرے دل میں یکایک تکذیب کا ایسا وسوسہ گذرا کہ جاہلیت میں بھی نہ گذرا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا۔ کہ کیا وسوسہ میرے دل میں گذرا ہے تو آپ صلعم نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا کہ میں پسینہ پسینہ ہوگیا گویا کہ میں اسوقت اللہ تعالےٰ کو دیکھ رہا تھا پھر فرمایا اے اُبیّ مجھے حکم دیا گیا کہ میں ایک ہی حرف پہ قراۃ پڑھوں۔ پھر مینے لوٹایا اور عرض کی کہ میری امت پر آسانی کیجائے پھر دوبارہ مجھے فرمایا گیا۔ کہ دو حرفوں پر پڑھو۔ پھر مینے اس بات کو لوٹایا۔ اور عرض کی کہ میری اُمّت پر آسانی کیجائے۔ پھر تیسری دفعہ

مجھے اجازت دی گئی۔ کہ سات حرفوں پر پڑھا کرو؛

(۵) عن ابی ابن کعب قال لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل فقال یا جبریل انی بُعِثتُ الی اُمَّۃٍ اُمّیّینَ منہم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والجاریۃ والرجل الذی لم یقرء کتابا قطّ قال یا محمّدُ اِنَّ القران انزل علی سَبْعَۃِ احرفٍ (ترمذی)

ابی بن کعب سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل سے ملے اور فرمایا۔ اے جبریل۔ میں اس امت کیطرف بھیجا گیا ہوں۔ جس میں بوڑھی عورتیں بوڑھے مرد لڑکے۔ لونڈیاں اور ان پڑھ لوگ ہیں۔ جبریل نے کہا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے؛

(۶) عن عمر ابن الخطاب یقول سَمِعْتُ ھشام ابن حکیم یقرء سورۃ الفرقان فی حیاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاستمعتُ قرأتہٗ فاذا ھو یقرءُ علی خلافٍ کثیرۃٍ لم یقرئنیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - فکدت اساورہ فی الصّلاۃ فتصبرت حتّی سلّم - فلببتہ بردائہ فقلت من اقرأک ھذہ السُّورَۃَ التی سمعتک تقرءھا قال اقرئنیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت لہ کذّبت واللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقرئنیھا علی غیر ما قرأت فَانْطَلَقْتُ بہٖ اقودہٗ

حضرت عمر ابن الخطاب فرماتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورہ فرقان پڑھتے سنا جب میں نے اسکا پڑھنا بغور سنا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سے ایسے حرف پر پڑھتا ہے جسپر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھایا۔ قریب تھا۔ کہ میں نماز ہی میں اس پر حملہ کروں۔ مگر میں نے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ جب اس نے سلام پھیرا۔ انکی چادر میں نے انکے گلے میں ڈال دی اور کہا یہ سورت جسکو میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ کس نے تمکو پڑھائی ہے۔ اس نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو۔ واللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان حروف کے غیر حرف پر پڑھائی ہے۔ جن پر تم پڑھتے ہو۔ پھر میں اسکو اسی طرح

الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت انی سمعت ھذا یقرء بسورۃ الفرقان علی حروفٍ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَرسِلہ یا عمر اقرء یا ھشام فقرأ علیہ القراۃ التی سمعتہ یقرءُ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھکذا اُنْزِلَتْ یا عمر ثم قال اقرء یا عمر فقرأت القراۃ التی اَقْرَأَنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ھکذا انزلت ان ھذا القران انزل علی سبعۃ احرف فاقرء وا ما تیسر منہ (بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لے کر چلا گیا۔ اور عرض کی کہ میں نے ہشام کو ایسے حروف پر سورہ فرقان پڑھتے سنا ہے۔ جن پر آپ نے مجھے قرآن نہیں پڑھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسے چھوڑ دو اور فرمایا یا ہشام پڑھ۔ اس نے وہی قرات پڑھی جو میں نے اسکو پڑھتے سنا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسیطرح یہ نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا اے عمر تم پڑھو میں نے اسیطرح پڑھا جسطرح آپ نے مجھے پڑھایا تھا۔ فرمایا۔ اسی طرح یہ نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ پس جو تم پر آسان ہو پڑھو؛

(۷) عن اُبَیّ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان عند اضاءۃ بنی غفار فاتہ جبریل فقال ان اللہ امرک ان تقرء امتک القران علی سبعۃ احرفٍ -

حضرت ابی کہتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضاءہ بنی غفار کے پاس تھے۔ جبرئیل آئے۔ اور انہوں نے کہا۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو یہہ اجازت دی ہے۔ کہ اپنی امت کو مختلف حروف پر قرآن پڑھائیں؛

(۸) عن جابرٍ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نقرء القران وفینا الاعرابی والعجمی فقال اقرء وا فکل حسنٌ وسیجیءُ اقوام یقیمونہٗ کما یقام القدح یتعجلونہ ولا یتاجلونہ

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر آنکلے اور ہم قرآن پڑھ رہے تھے۔ اور ہماری جماعت میں عربی و عجمی لوگ تھے۔ آپ نے فرمایا۔ پڑھے جاؤ۔ سبھی ٹھیک پڑھ رہے ہو۔ بعد میں ایسی قومیں آئیں گی جو قرآن کو بڑی عمدگی کے ساتھ پڑھیں گی ایسی صفائی سے جیسے کہ تیر سیدھا کیا جاتا ہے۔ مگر وہ اس کا اجر

اسی زندگی میں تلاش کریں گے۔ اور عاقبت کی پرواہ نہیں کریں گے ؎	

احرف کے متعلق صحاح میں صرف یہی حدیثیں ہیں۔

روایت اول میں دو بات کا ذکر ہے (۱) قرآن شریف کا نزول اصالتاً محاورۂ قریش پر ہوا ہے (۲) غیر محاورہ قریش پر کلام مجید کے پڑھے جانے کا ایک سبب حمیّت محاورہ و خودداری اقوام ہے۔ پانچویں حدیث میں سبعہ احرف کی اجازت کے اسباب کا ذکر ہے جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ اُمّت میں ایسے لوگ ہیں۔ جن کی زبان پر محاورۂ قریش کے الفاظ نہیں چڑھ سکتے۔ چھٹی حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ عمر بن الخطاب نے اس واقعہ ہشام سے پہلے کسی دوسرے شخص کو غیر محاورۂ قریش پر قرآن پڑھتے نہیں سنا تھا۔ اور ہشام بن الحکیم یقیناً فتح مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے ہیں۔ تہذیب التہذیب میں ہے۔ کانَ ھُوَ واَبُوہُ من مُسْلمی الفَتح ط کہ ہشام اور اس کا باپ فتح مکہ میں مسلمان ہونے والے لوگوں میں سے ہیں۔ اس موقعہ پر صاحب فتح الباری لکھتے ہیں۔ وَکَانَ سَبَبُ اختلافُ قِرأَتِهما۔ انّ عمر حفِظَ هٰذہِ السُوْرَۃَ مِنْ رَسُول اللهِ صلی اللهُ عَلَیہِ وَسلَّمَ قدیماً۔ ثم لم یَسْمَعْ ما نُزِّل فیها بخلاف ما حَفِظہٗ وشاھَدَہٗ لانّ ھشاماً من مُسْلِمی الفَتْح فکان النبی صلی الله علیه وسلم اَقرأہٗ علے ما نُزِّلَ اخیراً فمنشاءُ اختلافهما من ذٰلکَ۔ (فتح الباری جلد ۹ باب اُنزل القران علے سبعۃ احرف)

یعنے ان کے قرأۃ کے اختلاف کا سبب یہ ہے۔ کہ عمر نے بہت پہلے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سے اس سورۃ کو حفظ کیا تھا۔ اور ابھی تک ایسے اختلاف قرأۃ کو اس نے نہیں سُنا تھا۔ اور ہشام واقعہ فتح مکہ میں اسلام لانے والے لوگوں میں سے ہے۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے ہشام کو سورہ فرقان پڑھائی۔ ان حروف کی رعایت پر جو بعد میں نازل ہوئے تھے ؎

ساتویں حدیث میں اس مقام کا ذکر ہے۔ جہاں سبعہ احرف کی اجازت عطا ہوئی ہے جس سے یہ بات قطعاً پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے۔ کہ سبعہ حرف کی اجازت ہجرت کے بعد

مدینہ میں ہوئی ہے۔ کیونکہ اضاءۃ بنی غفار مدینہ منورہ کے ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ قال واضاءۃ بنی غفار ھو مُسْتَنْقَعُ المَاءِ کالغدیر (تالاب کے نہانے کی جگہ) فتح الباری میں ہے۔ ھو مَوْضِعٌ بالمدینہ ؎

نتیجہ روایات

ان مذکورہ حدیثوں پر مجموعی نظر ڈالنے سے ہم اس نتیجہ پر بآسانی پونچتے ہیں۔ کہ سبعہ احرف کی اجازت فتح مکہ کے بعد مدینہ منورہ میں ہوئی ہے۔ اور اس سے پہلے صرف ایک ہی محاورۂ قریش پر کلام اللہ شریف نازل ہوتا رہا ہے۔ اور اسی ایک ہی محاورہ پر پڑھا اور لکھا جاتا رہا ہے۔ یعنی ۹ سنہ ہجری کے قبل قرآن شریف کی قرأت میں کسی طرح کا اختلاف نہیں تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب عرب کے مختلف قبیلوں کے لوگ اور ان کے خاندانوں کے خاندان معہ عیال و اطفال شہری و بدوی کثرت داخلِ سلسلۂ اسلام ہوئے۔ جن میں بوڑھی عورتیں۔ بوڑھے مرد۔ کمسن بچّے اور ان پڑھ بھی تھے۔ یعنے ایسے لوگ تھے جن کی زبان سے صرف وہی الفاظ نکل سکتے تھے۔ جن کے استعمال کے وہ عادی تھے۔ اور دوسرے محاورہ کے الفاظ کا ان کی زبان پر چڑھنا ایک مشکل امر تھا۔ اور ایسے بھی لوگ تھے۔ جنہیں اپنے محاوروں کی حمیت اور قومی پاسداری کا لحاظ بھی تھا۔ یعنے وہ اپنے محاوروں کو چھوڑنا اپنی ہتک عزت سمجھتے تھے اِدہر ہر ایک مسلمان پر کچھ نہ کچھ حصہ کلام مجید کا یاد رکھنا ضروریاتِ دین سے تھا۔ لہذا اس مشکل کے رفع کرنے کے لئے آسانی کے لئے وسعتِ احرف کی دُعا مانگی گئی۔ اور وہ مقبول ہوئی ؎

تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے۔ کہ عربی قبائل کے لوگ گو ایک مدّت سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے گرویدہ تو تھے۔ لیکن اسلام کے اظہار کرنے میں فتح مکہ کے منتظر تھے۔ انہیں یقین تھا۔ کہ غیر صادق نبی ہرگز مکہ کو فتح نہیں کر سکتا اس لئے جب مکہ فتح ہوا۔ تو تمام عرب نے عموماً اسلام کا اظہار کر دیا۔ ابو شامہ کی روایت

کے الفاظ یہ "ولما کان فیہم الحمیۃ" کہ احرف کی اجازت کا ایک سبب عربی قوموں کی خودداری اور حمیّت محاورہ بھی ہے" بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔ کہ اس وسعتِ احرف کا زمانہ فتح مکہ کے بعد کا ہے۔ جبکہ عرب کے نامی وہ سات قبیلے داخل اسلام ہوئے۔ جن کے محاورے قریش کی روزمرہ کے خلاف تھے۔ اور ان میں اپنی اپنی قومی پاسداری اور محاوروں کی حمیّت بھی تھی۔ پھر اُبیؓ کی روایت ظاہر کرتی ہے کہ سبعہ احرف کی اجازت مدینہ منورہ کے مقام اضاءۃ بنی غفار پر ہوئی ہے۔ اس تحقیق کے بعد اب ہم تاریخ کو دیکھتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ سبعہ احرف کی اجازت کا زمانہ ابتدائے نزول کلام مجید سے انیس[19] سال بعد کا ہے۔ اور سارے قرآن شریف کے نزول کا زمانہ بروایت صحیح بیس سال ہے۔ جیسے کہ ہم پہلے تحقیق کر آئے ہیں۔ پس اس حساب سے سبعہ احرف کی اجازت سے پہلے ہی سارا قرآن مجید یا قریباً سارا نازل ہو چکا تھا۔ گویا اس اجازت سے قبل سارے کا سارا کلام مجید یا قریباً سارا ایک ہی محاورہ قریش پر اور اسی محاورہ کی رسم تحریر پر لکھا بھی جا چکا تھا۔ اور کسی غیر محاورۂ قریش کا کوئی ایک حرف بھی اس میں داخل نہیں ہوا تھا۔ جس کی نقل حرف بحرف حضرت زید نے زمانۂ ابوبکرؓ میں کی۔ اور پھر وہی قرآن کریم حرف بحرف بعینہٖ نقل ہو کر عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں شائع ہوا۔

اختلاف محاورات

یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ کہ محاورۂ قریش یعنے اصل محاورۂ قرآن شریف کو دوسرے قبیلوں کے محاوروں سے کسقدر اختلاف تھا۔ جہاں تک احادیث سے پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ اختلافات بہت خفیف تھے۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض محاورات کے بعض الفاظ ایسے تھے۔ کہ اصل محاورۂ کلام مجید میں ان کا قائم مقام کوئی اور لفظ تھا۔ لیکن معنے و مراد میں وہ دونو ایک ہی تھے۔ اور عام الفاظ میں صرف اتنا فرق تھا۔ کہ ایک محاورہ میں وہ ایک طرز پہ ادا ہوتے۔ اور دوسرے محاورہ

احرف کی اجازت کا مطلب

میں ان کی طرز ادا کچھ اور ہوتی تھی۔ یا ان دونوں میں اعراب کا فرق ہوتا تھا۔ قرآن کو سات حروف پر پڑھنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ کہ قرآن شریف کا ہر ایک لفظ سات طریق پر پڑھا جاتا تھا۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ قرآن شریف کے ہر ایک لفظ کو ہر ایک شخص جس طرح چاہتا۔ اپنے محاورہ کے دوسرے لفظ سے بدل لیتا۔ نہیں بلکہ ہر ایک لفظ اور ہر ایک کلمہ کی طرز ادا و اختلافِ اعراب وغیرہ میں محض انہی حروف و کلمات کی رعایت کیجاتی تھی۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے سنے جاتے تھے۔ پس سبعہ احرف کی اجازت کے یہ معنے ہیں۔ کہ جن محاورات میں قرآن شریف کے بعض الفاظ پڑھنے کی اجازت ہوئی۔ وہ سات تھے مثلاً العل محاورۂ قرآن میں ایک لفظ حتّٰی ہے۔ اور قبیلہ ہذیل کے محاورہ میں اس کے بجائے عتّٰی یعنے حرف عین سے بولا جاتا تھا۔ اسدی قبیلہ کے لوگ تَعْلَمُوْن کی تَ کو کسرہ کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اور ایک قبیلہ والے مَآءٍ غیرِ آسِنٍ کو مَآءٍ غیرِ یاسِنٍ پڑھتے تھے۔ ایسے ہی ایک قبیلہ کے لوگ ایسے الفاظ میں ہمزہ پڑھتے۔ جہاں اصل محاورہ میں ہمزہ نہیں پڑھا جاتا تھا۔ اور بھی اسیطرح کے اختلافات ہیں۔ الغرض یہ اختلافات جملوں اور عبارتوں کے اختلافات نہیں تھے۔ بلکہ ایسے خفیف تھے۔ جو مختلف قوموں اور مختلف امکنہ کے رہنے والوں کی روزمرّہ میں عموماً پائے جاتے ہیں۔

قرآن شریف کے تمام مختلف فیہ الفاظ کی فہرست دینا ایک نہایت مشکل بات ہے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں ایسے الفاظ کم ضبط ہوئے ہیں۔ جس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یا تو ایسے الفاظ کی تعداد ہی کم تھی۔ اور یا ان کے ضبط کو ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور جو کچھ کہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی حضرت ابن مسعود۔ ہشام اُبیؓ۔ ابوموسیٰ وغیرہ قرّاء کی یادگاریں ہیں۔ جنہوں نے اختلاف قرأت کے ضبط کو کمال قرآن دانی سمجھ رکھا تھا۔ اگر یہ حضرات احرف کی تعلیم اور اسکی ترویج میں زیادہ حصّہ نہ لیتے۔ تو تھوڑے ہی دنوں بعد اختلافات محاورہ خود بخود ہی مٹ جاتے۔"

اختلاف محاورہ کی کمی کے اسباب

عرب کے بڑے بڑے نامی قبیلے جب مشرّف باسلام ہوئے۔ تو ابتداءً ہر ایک قبیلہ کے لوگوں میں البتہ اپنے اپنے محاوروں کی حمیّت اور قومی خودداری کا اثر تھا۔ جس سے وہ اپنے محاوروں کو چھوڑ کر قریش کے محاورہ پر قرآن شریف کے پڑھنے کو قومی ہتک و عار سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ نہیں تھا۔ کہ محاورۂ قریش پر وہ قرآن شریف پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ ان سب قبائل میں قریش ہی کی زبان منجھی ہوئی اور اعلیٰ زبان تھی۔ پھر جب قرآن شریف کا نزول بھی اسی زبان پر ہوا۔ تو قریش کی نظروں میں غیر اقوام کے محاوروں کی وقعت اور بھی گر گئی۔ ادہر قرآن کی طرف سے اعلان پر اعلان ہونے لگے۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ۔ کہ قرآن جیسے ایک آدھ سورت بنالاؤ۔ جس سے غیر اقوام کے فصحاء و بلغاء کو نیچا دیکھنا پڑا۔ اب جب یہی قبیلے داخلِ سلسلہ اسلام ہوئے۔ اور قریش کے محاورہ پر انہیں قرآن شریف کے پڑھنے کی تکلیف دی گئی تو انہیں قومی پاسداری اس حکم کی تعمیل سے مانع ہوئی۔ اقتضائے وقت یہی تھا۔ کہ انہیں اپنے اپنے محاوروں پر کلام مجید کے پڑھنے کی اجازت دیدی گئی۔ اس وُسعتِ

وُسعت قرأت کا خوفناک نتیجہ؛

قرأت کا بظاہر خوفناک نتیجہ ایک تو یہ تھا۔ کہ تھوڑے ہی دنوں بعد کلام مجید کی نظم ایک حالت پر نہ رہتی۔ اور وہ الفاظ جو ایک لازوال ہستی کی زبانِ قدرت سے معجزہ کی صورت میں بیشمار برکات کا خزانہ لے کر نکلے تھے۔ وہ انسانی لفظوں میں بدل جاتے۔ اور ان کے معانی کی ظاہری لباس کی جیبیں مقدّس الفاظ کے بدل جانے سے برکات کے خزانوں سے خالی رہ جاتیں۔ قرآن کا اعجاز لفظی ٹوٹ جاتا۔ اور یہ ماننا پڑتا۔ کہ قرآن کے معانی انسانی الفاظ میں بھی ادا ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک محال امر ہے۔ اور وہ قرآن جس کا ہر ایک معنےٰ و لفظ جملۃً منزّل من اللہ سمجھا جاتا تھا۔ اور جس کا نام وحی متلوّ رکھا گیا تھا۔ وہ اس تعریف سے عاری ہو جاتا۔ اور الفاظ منزّلہ کے محفوظ نہ رہنے کے باعث عام منزّلہ

کتابوں کی طرح روایت بالمعنی کے ہاتھوں اپنی ساری عظمت کھو دیتا؛

وسعت قرأت سے قومی تنافر جاتا رہا

مگر قدرت الہیٰ جس نے کلام مجید کی حفاظت اپنے ذمہ پر لے رکھی ہے نے اس عام اجازت سے وہ گل کھلایا کہ معاملہ دگرگوں ہو گیا۔ وہ قریشی خطیب کہ عرب کے دوسرے قبائل کے محاوروں کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ اور ان پر گفتگو کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں ہی نے غیر محاورۂ قریش پر قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ اور قرأت میں وہ کمال پیدا کیا کہ عام قبائل عرب کو ان کے محاوروں کے مطابق تعلیم دینے پر قادر ہو گئے۔ قریش کی اس ہر دلعزیز چال کو دیکھ کر دوسرے قبائل کے لوگ بھی لغتِ قریش پر قرآن کے پڑھنے پر مائل ہو گئے۔ نہ وہ حمیّتِ محاورہ رہی۔ نہ قومی پاسداری کا مخل اثر رہا۔ بالآخر تھوڑے ہی دنوں کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی موجودگی میں ہر ایک قبیلے کا ہر ایک شخص محاورۂ قریش پر قرآن شریف کو بیدھڑک پڑھنے پر قادر ہو گیا۔ اور بعض تو ایسے حضرات بھی تھے۔ کہ ساتوں حروف کی رعایت پر ہر ایک آیت قرآنی کی تلاوت کر سکتے تھے۔ علاوہ اس کے ایک اور بڑی زبردست اور پُراثر تحریک بھی تھی۔ جو عام لوگوں کو محاورۂ قریش پر قرآن شریف کے پڑھنے کی طرف بزور کھینچتی رہتی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ عام لوگوں کو سبعہ احرف پر قرآن پڑھنے کی اجازت دیتے تھے۔ اور اس طرح پر پڑھنا وحی الہیٰ کی ہدایت کے بموجب عمل میں آیا تھا

رسول کریمؐ فرضیہ نمازوں میں قریش ہی لغت پر قرآن پڑھا ہے

اور خود آپ صلعم نے بھی بعض وقت غیر محاورۂ قریش پر آیات کی تلاوت فرمائی ہے۔ لیکن فرضیہ نمازوں میں آپ صلعم نے ہمیشہ اصل محاورۂ قرآن ہی پر قرآن کریم کو پڑھا ہے۔ کسی روائت سے یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقعہ پر نماز میں غیر محاورۂ قریش پر قرآن شریف پڑھا ہے۔ صحابہ کرام چونکہ ہر ایک فعل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو بہترین اعمال جانتے تھے اور اس سے سرمو تجاوز کرنے کو باعثِ گمراہی و الحاد تصور کرتے تھے۔ لہذا بالطبع ہر ایک شخص خواہ وہ کسی قبیلہ کا ہوتا۔

محاورہ قریش ہی پر قرآن شریف کے پڑھنے کا مشتاق رہتا تھا - اور یہ کوئی ایسی بات نہ تھی - جسکو اہل عرب نہ کر سکتے - اگر حضرت ابن مسعودؓ و ابی بن کعبؓ و ہشام و ابو موسےٰ اشعری وغیرہ قرّاٗ احرف کی ترویج میں کوشاں نہ ہوتے - اور معذورین کے سوائے دوسروں کو خواہ مخواہ احرف کی حمیّت پر قائم رکھنے میں سعی نہ کرتے - تو چند ہی دنوں بعد احرف کا نشان تک ہی نہ رہتا - آخر کار ایسا ہی ہوا - کہ قرّاٗ کی ایک بہت بڑی زبردست جماعت کی سعی بلیغ کے ہوتے ہوئے عام صحابہ کرام نے محاورۂ قریش ہی پر قرآن شریف کے پڑھنے پر اتفاق کر لیا - جس کے متعلق ہم آگے چلکر بحث کرینگے۔

حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرضی نمازوں میں محاورۂ قریش ہی پر ہمیشہ قرآن شریف کا پڑھنا - اس امر کی صریح دلیل ہے - کہ سبعہ احرف کی اجازت محض وقتی اور عارضی اجازت تھی - اصل کلام مجید اور اس کی تکمیل میں انہیں کوئی دخل نہیں تھا - اور کیونکر دخل ہوتا - قرآن کریم وہ قدسی کلمات ہیں - جن کو خداوند عالم نے اپنے احاطۂ علمی سے معنوں پر موزون کیا ہے - اس کا ایک ایک لفظ مقامی رعایت - حُسن ادا - خوش اسلوبی برکات - چسپیدگی - جذب قلوب - تزکیہ نفس وغیرہ وغیرہ خوبیوں کا اسقدر بیشمار خزانے اپنے دامن کے تلے رکھتا ہے - کہ ممکن ہی نہیں - کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ ایسی خوبیوں کا جامع کوئی دوسرا شخص لا سکے - نہ جبریل علیہ السلام میں یہ قدرت ہے - نہ رسول میں نہ کسی اور فصیح و بلیغ خطیب میں - پس یہ کیونکر ہو سکتا تھا - کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرضیہ نمازوں میں (جس میں انسان گویا خداوند عالم سے ہمکلام ہوتا ہے ان کلمات عالیہ (جو زبان قدس سے نکلے ہیں) کو چھوڑ کر ان کی جگہ قومی الفاظ استعمال کرتے - اسی طرح اَجلّہ صحابہ مثل ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ہمیشہ محاورۂ قریش ہی پر قرآن کو پڑھا ہے اور ترویج احرف کو ناپسند رکھا ہے - چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جب یہ سنا - کہ ابن مسعود کوفہ میں لوگوں کو لغتِ ہذیل پر قرآن کی تعلیم دیتے ہیں - تو ان کے نام یہ فرمان جاری کیا "کہ کلام مجید کا نزول اصالتہً لسانِ قریش پر ہوا ہے - پس آپ لوگوں کو ہذیل کے محاورہ پر قرآن نہ پڑھائیں - ہذیل کی بولی

میں - حتّٰی کی بجائے عتّٰی (بالعین) بولتے ہیں - گویہ لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے مطابق صحیح ہے - اور اس کے پڑھنے سے کوئی قباحت بھی لازم نہیں آتی لیکن جو شخص حتّٰی پڑھ سکتا ہے - خواہ مخواہ اُسے عتّٰی پڑھنے پر مائل کرنے کی کیا ضرورت ہے اس لئے حضرت عمرؓ نے ابن مسعود کو اس سے منع کیا" فتح الباری جلد ۹ میں ہے -

حضرت عمرؓ کا فرمان ابن مسعود کے نام پر

(و مِن ثُمّ اَنکرَ عمرُ علیٰ ابن مسعودٍ قرائَتَہٗ "عتّٰی حِیْنٍ" وکتَبَ اِلَیہِ اَنَّ القُراٰنَ لَمْ یَنْزِلْ بلُغَۃِ ھذیلٍ فَاَقْرِءُ النَّاسَ بِلُغَۃِ قریشٍ وَلَا تقرِئْہُم بِلُغَۃِ ھُذَیلٍ -) کہ جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا - کہ ابن مسعود "عتّٰی حین" پڑھاتے ہیں - تو انہیں ناگوار گذرا - پھر انہوں نے ابن مسعود کے نام ایک فرمان جاری کیا - کہ قرآن لغت ہذیل پر نازل نہیں ہوا - پس تم لوگوں کو قریش کی لغت پر قرآن پڑھایا کرو - اور لغت ہذیل پر ہرگز مت پڑھاؤ"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب مصاحف نقل کرائے - تو انہوں نے بھی یہی حکم دیا - کہ وحی کی کتابت محاورہ قریش کے برخلاف نہ ہو - تاکہ تنزیل اور کتابت تنزیل میں مطابقت رہے - حضرت عمرؓ و عثمانؓ ایسے شخص نہیں کہ کہا جائے کہ انہیں احرف کی حقیقت پر علم نہ تھا - نہیں - بلکہ وہ ان کی حقیقت سے پورے واقف تھے - وہ جانتے تھے - کہ قرآن وحی متلو کا نام ہے - اور احرف کی اجازت محض وقتی اور مقامی ضرورت کا دفعیہ ہے - اب جب ضرورت نہیں رہی تو اجازت کا ارتفاع ایک لازمی امر ہے"

قرآن مجید کی کوئی آیت غیر محاورہ قرآن پر نہیں لکھی گئی

اگر قرآن مجید کے کسی حصّہ کی کتابت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سبعہ احرف کی رعایت کے مطابق الفاظ درج کرائے ہوتے تو حضرت زید (کاتب وحی) کو اس پر ضرور علم ہوتا - اول تو خود زید ہی نے اپنی قلم سے ان کو لکھا ہوتا - اور اگر ان کی غیر حاضری میں کسی اور کاتب کی قلم سے لکھے گئے ہوتے - تاہم زید کی نظر سے ان کا گذرنا ضروری تھا - اس لئے کہ حضرت زید کاتب وحی بھی تھے - اور ساتھ ہی وہ قرآن شریف کو حفظ بھی کیا کرتے تھے - اور جو آئتیں اور سورتیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خاص نگرانی سے لکھی جاتی تھیں - ان کی حفاظت

بھی عموماً زید ہی کے ذمہ میں رہتی تھی۔ پھر جب عہد صدیق ؓ میں اسی زید نے مصحف کو جمع کرنا شروع کیا۔ اور اس کام میں زیادہ تر انہیں پر اعتماد بھی تھا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس امین کاتب نے تمام کلام مجید کو اپنی رائے کے مطابق متغیر و محرف کر ڈالا ہو گا۔ اور کیا وہ ان تمام حروف کو جنہیں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی ہدایت کے مطابق لکھوایا تھا۔ یکلخت قلم انداز کر سکتے تھے۔ پھر ان کے اس فعل شنیع پر کسی جان باز صحابی کو اتنی جرأت نہ ہوئی۔ کہ ان کو ایسے تاریک گناہ کے ارتکاب سے منع کرتا؟ تمام ذخیرۂ احادیث سے کہیں بھی یہ پتہ نہیں چلتا۔ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید کاتب مصحف کو یہ ہدایت یا تاکید کی تھی۔ کہ وہ مصحف کو صرف ایک ہی محاورۂ قریش پر جمع کرے۔ نہ ہی کہیں سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ زید نے دوسرے قبائل کے حروف سے کانٹ چھانٹ کر مصحف تیار کیا تھا۔ بالفرض اگر زید اس کام پر آمادہ ہو بھی گئے ہوتے۔ تاہم ہزارہا صحابہ جو اسوقت موجود تھے۔ انہیں ایسا کیوں کرنے دیتے۔ یہ کام کوئی تنہائی میں تو ہوا ہی نہ تھا۔ بلکہ مجمع عام میں لکھا جاتا تھا۔ اور ہر ایک صحابی لکھے ہوئے اوراق مصحف کو ہر وقت دیکھ بھال سکتا تھا۔ اسلامی تاریخ کوئی سیاہ و تاریک تاریخ نہیں ہے اس میں رسول کریم ؐ اور تمام صحابہ رضی کے حالات ذرہ ذرہ لکھے پڑے ہیں۔ اگر صحابہ ؓ میں اس وقت کوئی تنازع دربارۂ ترک کتابت احرف ہوا ہوتا۔ تو ضرور اس کا تذکرہ حرف بحرف ہم تک پہنچتا۔ پس ہم کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وحی منزل کی جو تحریریں اپنی خاص نگرانی سے لکھوائی تھیں۔ وہ سب کی سب ایک محاورۂ قریش ہی کی رسم کتابت پر لکھوائی تھیں اور ان میں کسی دوسرے قبیلے کا کوئی ایک حرف بھی درج نہیں ہوا تھا۔ پس حضرت زید نے بعینہٖ انہی تحریروں کو ایک مصحف میں جمع کیا۔ اور پھر وہی کلام مجید بلا کم و کاست عہد عثمان میں نقل ہو کر شائع ہوا؟

صاحب اتقان کا قول

مفسرین میں سے صاحب اتقان (جلال الدین سیوطی) ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب قرآن مجید کو مصحف میں جمع کرنے کا قصد کیا۔ تو انہوں نے بعینہٖ اس قرآن کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا اہتمام کیا۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں متفرق طور پر لکھا گیا تھا۔ اس واسطے مصحف صدیق میں ان سب مختلف

قرأتوں کے الفاظ موجود تھے۔ جو آخری دور سے پہلے ایک سے سات طرح تک پڑھے جاتے تھے؟

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں غرضیکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت کی تلاوت اور کتابت میں مختلف قرأتوں کے سات طرح تک کے الفاظ قرآن مجید میں شامل تھے۔ جو آخری دور میں بہت سے حذف ہو گئے تھے۔ ابن اُشتہ نے ابن سیرین سے روایت کی ہے۔ کہ انہوں نے کہا۔ جبرئیل علیہ السلام ہر سال ماہ رمضان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کا ایک مرتبہ دَور فرمایا کرتے تھے۔ مگر جب وہ سال آیا جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت ہوئی ہے۔ تو جبرئیل ؑ نے آپ صلعم سے دو مرتبہ دَور کیا ہے۔ اس لئے علماء کا خیال ہے۔ کہ ہماری قرأت آخری دور کے مطابق ہے۔ بغوی شرح السنہ میں لکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ زید بن ثابت قرآن کے اس آخری دور میں حاضر رہے تھے۔ جس کے اندر بیان کیا گیا تھا۔ کہ کتنا حصہ کلام مجید کا منسوخ ہو گیا ہے۔ اور کسقدر باقی ہے۔ اور چونکہ زید بن ثابت ہی نے اسکو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھ کر پھر اسے آپ صلعم کو سنا کر پڑھا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ زید بن ثابت اس قرآن کو رسول کریم ؐ کی وفات تک لوگوں کو پڑھاتے رہے تھے۔ اس واسطے ابوبکر ؓ و عمر ؓ نے اس قرآن کو قابل اعتماد مان کر جمع کر لیا۔ اور عثمان ؓ نے اسے مصاحف میں لکھنے کی خدمت ادا کی؟ انتہی (از اتقان سیوطی)

صاحب اتقان کا دعوےٰ تو یہ ہے۔ کہ مصحف صدیق میں مختلف قرأتوں کے الفاظ موجود تھے

اتقان کے قول پر ایک نظر

اور اس کے ثبوت میں جو کچھ پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کی تلاوت اور کتابت میں مختلف قرأتوں کے الفاظ قرآن مجید میں شامل تھے۔ جو آخری دور میں بہت سے حذف ہو گئے

(۲) پھر اس کی تائید ابن اشتہ کے قول سے کرتے ہیں "اس لئے علماء کا خیال ہے۔ کہ کہ ہماری قرأت آخری دور کے مطابق ہے۔ (جیسے کہ ہم آگے سبعہ احرف کے خاتمہ پر لکھیں گے)

(۳) ماحصل قول بغوی زید بن ثابت آخری دور میں شریک تھے۔ اور رسول کریم ؐ کی وفات تک لوگوں کو قرآن پڑھاتے رہے تھے۔ اس لئے کتابت مصحف کے لئے منتخب ہوئے؟

ان تمام تقریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ رسول کریمؐ نے اپنی رحلت کے سال میں کلام مجید کی قرأت کی اصلاح کر دی تھی۔ (یعنے کلام مجید میں سے اصلی قرأت کے سوائے دوسری تمام قرأتوں کے الفاظ حذف کر دئے تھے) زید بن ثابت اس بات پر پورا پورا علم رکھتے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا۔ کہ قرآن مجید کا فلاں حصّہ یا آیت۔ یا لفظ متروک یا محذوف ہو گیا ہے۔ چنانچہ بعد میں وہ اسی رعایت کے ساتھ تا وفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو قرآن پڑھاتے بھی رہے وغیرہ وغیرہ؎

ان سب باتوں کو مان کر مولانا جلال الدین کا پھر یہ لکھنا کہ مصحفِ صدیقؓ میں تمام مختلف قرأتوں کے الفاظ درج تھے۔ کیا معنے رکھتا ہے۔ گویا زید نے (جن پر کتابتِ وحی اور صحت قرأتِ مختار دورہ اخیر کا بڑا اعتبار تھا) جمع مصحف کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ یعنے مصحف میں انہوں نے دوبارہ وہ سب کے سب الفاظ درج کر دئیے جنکو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کے مطابق حذف کیا تھا۔ اور پھر ابو بکرؓ صدیق و عمرؓ و عثمانؓ و علی وغیرہم الوف صحابہؓ نے بھی اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ فھٰذا عجَب کل العجب۔

یہ اس بوڑھے حافظِ حدیث کی تحقیق ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ اس بوڑھے حافظ مولٰنا جلال الدین صاحب اتقان کا محدثین میں کیا اعتبار ہے۔ اور ان کی روایات کہاں تک قابل وثوق مانی گئی ہیں؎

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اپنے رسالہ عجالۃ النافع (جو کہ علم اصول حدیث میں ایک مختصر مگر نہایت قیمتی رسالہ ہے۔) میں لکھتے ہیں؎

احادیث کے چار طبقے ہیں۔ طبقۂ اوّل میں (جو سب سے زیادہ معتبر ہے) موطا امام مالک۔ بخاری مسلم ہیں۔ طبقۂ دوم میں ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی ہے (جو بلحاظ اعتبار کے طبقۂ اول سے کم درجہ ہیں۔) طبقۂ سوم میں وہ کتابیں ہیں۔ جن کی مقبولیت عام طور پر نہیں ہوئی۔ اور ان میں ایسے راوی ہیں۔ جن کے ثقہ ہونے میں اور ان کی راستگوئی پر بڑی جرح ہوئی ہے۔ مثلاً۔ طبرانی۔ طحاوی۔ بیہقی۔ مستدرک حاکم۔ سنن ماجہ و دارمی وغیرہ۔ طبقۂ چہارم جو بلحاظ اعتبار کے تمام درجوں سے کم ہے۔ اس کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں "طبقۂ رابعہ جو بلحاظ اعتبار کے

تمام درجوں سے کم ہے۔ اس کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ طبقۂ رابعہ "احادیثے کہ نام و نشان آنہا در قرون سالفہ معلوم نہ بود۔ و متاخرین آن را روایت کردہ اند۔ پس حال آنہا از دو شق خالی نیست یا سلف تفحّص کردند۔ و آنہا را اصلے نیافتہ اند۔ تا مشغول آنہا شدند۔ یا یافتند و در آنہا قدحے و علّتے دیدند۔ کہ باعث شد ہمہ آنہا را بر ترک روایات آنہا و علےٰ کلِ تقدیر ایں احادیث قابل اعتماد نیستند و مایہ تصانیف شیخ جلال الدین سیوطی در رسائل و نوادر خود ہمیں کتابہا است"؎ یعنے جلال الدین سیوطی کی تصانیف کا ماخذ طبقہ چہارم کی روایات ہیں۔ جو ہرگز اعتبار کے قابل نہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی رائے تصانیف سیوطی کے متعلق

اسقدر بحث کے بعد اب ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محاورۂ قریش کے سوائے جن محاورات پر یا جن حروف یا قرأتوں پر قرآن کے پڑھے جانے کی اجازت دی تھی۔ وہ صرف وقتی اور مقامی ضرورت کے لئے تھی۔ اور آپؐ نے یہ کبھی حکم نہیں دیا۔ کہ انکو تحریر میں لایا جائے۔ ان حروف کی اجازت دینے سے نہ آپ صلعم کا اور نہ ہی وحی الٰہی کا یہ منشیا تھا۔ کہ یہ سب قرأتیں ہمیشہ کیلئے جزوِ قرآن سمجھی جائیں۔ پس قرآن شریف جس طرح احرف کی اجازت سے پہلے ایک ہی حرف پر لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح احرف کی اجازت کے بعد بھی اس کی آئتیں اور سُورتیں ہمیشہ اپنے اصلی محاورہ پر لکھی جاتی رہی ہیں۔ احرف کی اختلاط قرأت سے اس کی کتابت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انہی آیات متفرقہ کو ابو بکر صدیقؓ نے مصحف میں جمع کرایا۔ اور پھر عثمانؓ نے حرف بحرف اس کی نقلیں کرائیں۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ اگر مصحف صدیقؓ میں مختلف قرأتوں کے الفاظ درج نہ ہوتے۔ تو پھر حضرت عثمانؓ نے یہ کیوں حکم دیا تہا۔ کہ "قریش کاتبوں اور زید میں اگر کسی بات کا اختلاف ہو۔ تو اُسے لسانِ قریش پر لکھیں"؎ ہم کہتے ہیں۔ کہ آپکا یہ حکم محض احتیاطی تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا۔ کہ زمانۂ نزول کلام مجید کی لکھی ہوئی آئتیں چونکہ متفرق کاتبوں کے ہاتھ سے لکھی گئی تھیں۔ ان کی طرزِ تحریر میں اور خاص محاورۂ کلام مجید میں کچھ اختلاف ہو۔ پھر چونکہ مصحفِ صدیقؓ میں ان کو زید نے جمع کیا تھا۔ اور وہ مدنی تھے۔ اس لئے یہ بھی ممکن تھا۔ کہ ان کی تحریر میں کوئی لفظ خلاف محاورۂ قریش پر لکھا گیا ہو؎

لیکن ذخیرۂ احادیث میں اس بات کی کافی شہادت موجود ہے۔ کہ تمام کلام مجید کی نقل میں

صرف ایک لفظ (تابوت) پر قریش کاتبوں اور زید میں اختلاف ہوا تھا جیسے کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ آخر اسکو قریش رسم تحریر یعنی لمبی ت کے ساتھ لکھنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کے سوائے اور کسی مقام پر کسی لفظ کے لکھنے میں جماعت کاتبانِ کلام مجید میں اختلاف نہیں ہوا۔ اس سے اور مزید اطمینان ہوتا ہے۔ کہ زمانہ نزول کلام مجید میں گو مختلف کاتبوں کے ہاتھ سے قرآن مجید لکھا جاتا تھا۔ مگر اُن کی تحریریں کچھ اختلاف نہ تھا۔ یعنی قرآن شریف کی تمام آئتیں و سُورتیں ہمیشہ محاورۂ قریش ہی کی رسمِ تحریر پر ضبط ہوا کرتی تھیں ؛

مروّجہ سات قرأتیں

جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ مصحف عثمانی صرف محاورۂ قریش ہی کی رسم تحریر پر لکھا گیا ہے۔ اور اس میں کسی دوسرے حرف کے اندراج کو جائز نہیں رکھا گیا۔ اور بعہد خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ عام تعلیم قرآنی سبعہ احرف کی وسعتِ قرأت سے سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حرفِ قریش میں محدود ہو گئی تھی۔ تو اب سوال یہ ہوتا ہے۔ کہ مروّجہ سات قرأتیں کہاں سے پیدا ہوئیں۔ اور کیونکر جائز سمجھی گئیں ؛

مروّجہ سبعہ قرأتیں سبعہ احرف والی قرأتیں نہیں ؛

جاننا چاہیئے کہ وہ سات قرأتیں جو عرب کے مختلف سات قبائل کے اختلافِ لب و لہجہ سے پیدا ہوئی تھیں اور جن کی تجویز و تعلیم بذریعہ وحی (اِنَّمَا اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ) عمل میں آئی تھی۔ اور یہ سات قرأتیں جو آجکل قاریوں کی زبان پر جاری ہیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ یہ دونوں قرأتیں ایک نہیں ہیں۔ موجودہ قرأتوں کو سبعہ احرف والی قرأتیں سمجھنا ہرگز درست نہیں بلکہ سخت غلطی ہے ہاں یہ ممکن ہے۔ کہ سبعہ احرف والی قرأتوں کے بعض الفاظ ان موجودہ قرأتوں میں پائے جاتے ہوں۔ لیکن چونکہ احادیث مستندہ و روایات معتبرہ کے ذریعے سبعہ احرف والی قرأتوں کے تمام الفاظ کی فہرست تیار کرنا ایک مشکل بلکہ ناممکن امر ہے۔ اسلیئے کہ ان روایات میں ایسے الفاظ کا ذکر بہت کم آیا ہے۔ لہذا موجودہ قرأتوں میں سے سبعہ احرف والی قرأتوں کے الفاظ کی الگ فہرست چھانٹنا بھی امر محال ہے۔ اور اصحاب قرأت نے اپنی قرأتوں کے ثبوت میں جو روایات پیش کی

ہیں۔ وہ اصول حدیث کے میزانِ اعتدال سے گری ہوئی ہیں۔ اس لئے موجودہ قرأتوں کی اصلیت کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانا اگر ناممکن نہیں۔ تو آسان کام بھی نہیں ہے ؛

قرأتیں کسطرح پیدا ہوئیں

تفاسیر میں ان قرأتوں کے پیدا ہونے کے جو وجوہ بتائے جاتے ہیں۔ وہ اور بھی بعید از قیاس ہیں۔ مثلاً اتقان سیوطی میں ہے۔ (۱) مصحف امام پر نقطے اور اعراب نہیں لگائے گئے تھے۔ اس لئے مختلف بلاد میں ایک ہی کلمہ نے اختلاف اعراب کے باعث کئی شکلیں پیدا کریں۔ جیسے مَلَکَ۔ مَلِکِ۔ مَلِکِ ایسے ہی اعراب کے نہ ہونے کے باعث صرف و نحو کے قواعد کے مطابق جو لفظ کئی طرح پر پڑھا جا سکتا تھا۔ اسے ایک مقام پر ایک قاری نے ایک اعراب کے ساتھ پڑھا۔ اور دوسرے نے دوسرے اعراب کے ساتھ۔

(۲) جو قرأتیں اپنی طرز تحریر میں قرآن شریف کے الفاظ سے نہیں ملتیں۔ وہ سبعہ احرف والی قرأتیں ہیں۔ انتہی (از اتقان)

(۳) ایک اور صاحب تفسیر لکھتے ہیں۔ ایک کلمہ کو بطریق مثال یا بطریق تشریح یا تفسیر کسی نے حاشیئہ کتاب پر لکھا۔ اور پھر وہ قرأت میں داخل ہو گیا۔ (وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلْبَیْت) وغیرہ وغیرہ ؛

مفسرین کی ایسی بے سر و پا تاویلات کو دیکھکر ایک تعجب پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک کلمہ کو جس کے ثبوت میں وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ ایسے کلمہ متلو کا ہم پلّہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو جبریل علیہ السلام لائے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہبط وحی نے ممبر پر چڑھ کر اس کا اعلان فرمایا۔ اور اپنی خاص نگرانی سے اس کو لکھوایا۔ حفّاظ کو یاد کرایا۔ مدت العمر اس کی تلاوت فرمائی۔ اور دوسروں سے بھی سُنا کیئے۔ جس کی قرأت لاکھوں صحابۂ کرام سے نسلاً بعد نسلٍ بطریق تواتر ہم تک پہونچی ہے۔ جس کے نسخے اس رسم الخط پر لکھے ہوئے آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جس رسم تحریر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بواسطۂ تعلیم وحی اس کو لکھوایا تھا۔ فہذا عجب

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ عہد عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد قرأتوں کی تعداد بالکل گھٹ گئی تھی۔ ایسے ہی تابعین نے بھی اس کی طرف چنداں توجہ نہیں کی۔ بعد میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی۔ جس نے قرأت کو از سرِ نو رواج دیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ ایک مستقل فن

بن گیا۔ اس لئے قرأت متلو کے سوائے دوسری قرأت کو قبول کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کی معتبر اور یقینی شہادت ہونی چاہیئے۔ صرف اسکی روایت کو کسی صحابی تک پہنچا دینے سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ قرأت جزو کلام مجید ہے۔ یا مثلِ قرآن متلو ہے۔ قابل تسلیم نہیں ہو سکتی؛

کیا نقطوں اور اعرابوں کے نہ لکھنے سے قرأت میں اختلاف ہو سکتا ہے

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ نقطوں اور اعرابوں کے نہ ہونے سے آیا قرآن کی قرأت میں اختلاف ہو سکتا ہے یا نہیں ہم بآواز بلند کہتے ہیں۔ کہ نقطوں اور اعراب کے ہونے یا نہ ہونے سے قرآن مجید کی قرأت اور اس کی عبارت میں کوئی ہرج نقص اور اختلاف واقعہ نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو یہی خیال غلط ہے۔ کہ مصحف مجید بالکل نقطوں اور اعراب سے عاری تھا۔ البتہ یہ بات قابل تسلیم ہے۔ کہ بالاستیعاب اس میں نقطے اور اعراب نہیں تھے۔ کیونکہ عموماً اہل عرب ایجاز اور اختصار کو زیادہ پسند رکھتے

کلام مجید کی صحت کا مدار دہن مبارک نبوی ہے

ہیں۔ اس لئے وہ ضرورت کے سوائے نہ تو نقطے لگاتے تھے۔ اور نہ اعراب مگر یہ نہیں تھا۔ کہ وہ نقطہ لگانا جانتے ہی نہ تھے۔ بہر حال اگر ایسا ہی ہو تاہم کلام مجید کی صحّت کا مدار نہ تو اس کے اعراب ہیں۔ اور نہ نقطے۔ اور نہ ہی عرفی مصطلحہ قواعد صرف ونحو۔ یہ قواعد ایجاد بشریہ ہیں اور کلمہ متلو جزو کلام قدیم ہے۔ جو کہ ایک ہستی لازوال خالق علم وکلام کی زبان قدس سے نکلکر ہم تک پہنچا ہے۔ بلکہ کلام مجید کی قرأت کی صحّت کا مدار اور اس کے اعتدال کا میزان حضرت ختم نبوۃ علیہ التحیۃ والتسلیم مہبط وحی کی زبان مبارک ہے۔ بس جس طرح اور جس انداز پر ایک کلمہ قرآن شریف کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے نکلا ہے۔ وہ کلمہ اُسی انداز اور اُسی طرز پر ادا ہو۔ تو صحیح ہے ورنہ غلط۔ اور جس رسم تحریر پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لکھوایا ہے۔ اس کی تحریری صحّت اسی رسمِ تحریر پر لکھے جانے سے ہی ہو سکتی ہے اور بس؛

کلام اللہ کی حفاظت تحریر وحفظ سے ہوئی

پچھلی بحثوں میں ہم بوضاحت لکھ آئے ہیں کہ قدرت الٰہی نے کلام مجید کی حفاظت کے لئے دو ظرف معین کئے تھے۔ یعنے تحریر و حفظ۔ کہ جوں ہی کوئی آیت نازل ہوتی۔ فوراً لکھ لیجاتی۔ اور حفّاظ کے زندہ دلوں کی لوحوں پر بھی کندہ کر دی جاتی تھی۔ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ہی میں سارے کا سارا کلام مجید تحریر میں بھی

ضبط ہو گیا۔ جیسے کہ فتح الباری جلد ۹ میں ہے۔ وَقَدْ كَانَ الْقُرْآنُ كُلُّهُ كُتِبَ فِي عَهْدِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اور حفّاظ کے سینوں میں بھی بصحّت تمام جمع ہو گیا۔ اس کے بعد عہدِ ابوبکر رضی اللہ عنہ میں جب متفرق تحریروں کو ایک مصحف میں جمع کر دینے کا مسئلہ تجویز ہوا۔ تو اس وقت بھی اس کی صحّت کا مدار تحریر و حفظ کی مجموعی شہادت ہی پر قائم ہوا۔ یعنے کاتبِ مصحف ایک آیت کو پہلے مخازن تحریر سے تلاش کرتا۔ اور پھر دوبارہ حفاظ کے سینوں میں سے جانچ پڑتال کر کے ضبط تحریر میں لے آتا۔ اور جب تک یہ دونو شہادتیں متفقہ طور پر ایک آیت پر نہ گذر جاتیں۔ اس وقت تک وہ آیت مصحف مجید میں لکھی نہ جاتی تھی؛

اس کے بعد عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں جب مصاحف نقل کرائے گئے۔ اس وقت بھی اس دہری شہادت سے کام لیا گیا۔ بعد ازاں تابعین وتبع تابعین سے لے کر آج تک جملہ اہل اسلام کا بھی بطریق تواتر اسی تجویز پر تعامل چلا آتا ہے۔ کہ آیات کی صحت میں کتاب اور حفّاظ دونوں کی شہادت سے کام لیتے ہیں۔ تاریخ بآواز بلند شہادت دیتی ہے۔ کہ جہاں اسلام نے قدم بڑھائے ہیں۔ وہاں حفّاظ کی ایک جماعت بھی اُس کے ساتھ پہونچی ہے۔ کیا اسلام پر کوئی ایسا وقت بھی آیا ہے۔ کہ کسی جگہ مسلمان تو ہوں۔ ان کے پاس کتاب اللہ بھی ہو۔ لیکن انہیں پڑھانے والا قرآن دان کوئی بھی نہ ہو۔ پھر وہ لوگ خود بخود اس کلام مجید کو پڑھ لیں۔ اور اپنی تراش کی خواندہ پر ایسا وثوق کر لیں کہ بعد میں انکو ہزار طرح سمجھایا جائے۔ کہ اصل عبارتِ تنزیل اس طرح پر ہے۔ یہ اعراب غلط ہے مگر وہ اس سے نہ ٹلیں۔ اور پھر لطف یہ کہ مفسّرین ان کی تراش کو وحی متلو کا ہم پلّہ بنانے میں کوئی دریغ نہ کریں۔ پس یہ غلط بات ہے۔ کہ موجودہ قرأتیں مصحف امام پر نقطوں اور اعرابوں کے نہ ہونے سے پیدا ہوئی ہیں۔ کیونکہ کلام مجید کی صحّت کا مدار نہ عربیت کا مصطلحہ عرفی قواعد ہیں نہ صرف کتاب۔ بلکہ تحریر و حفظ دونوں کی مجموعی شہادت ہے؛

قرأت موجودہ کے پیدا ہونیکے اسباب

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے۔ موجودہ قرأتوں کے پیدا ہونے کے اسباب امور ذیل معلوم ہوتے ہیں:-

(۱) مصاحفِ عثمانی کے نسخے جب بحرین - شام - یمن وغیرہ میں بھیجے گئے - اور ساتھ ہی یہ حکم بھی سنایا گیا - کہ آئندہ قرآن مجید کی تعلیم مصحفِ امام کے حرف ہی پر ہوا کرے - تو اُن اصحاب وقرّاء نے جو وہاں تعلیم قرآن کے لئے معیّن تھے - اس حکم کی تعمیل میں ایسے حروف تو ترک کر دیئے - جو صریحاً مصحفِ امام کی رسم الخط کے خلاف تھے - لیکن بالاستیعاب نقطوں اور اعرابوں کے نہ ہونے سے انہوں نے ایسے حروف کو بحالہ قایم رکھا - جو مُڑ تُڑ کر رسم الخط کے تحت میں آ سکتے تھے - اور یہ یقین کر لیا کہ اس قسم کی قرأت جایز ہے - مثلاً یَعْلَمُوْنَ کے بجائے تعلمون (بکسرتائے فوقانی) اور ضحیٰ و سجیٰ و قلیٰ وغیرہ کا اِمالہ باوجودیکہ وہ قرّاء یہ خوب جانتے تھے - کہ یہ قرأت لغۃ قریش کے خلاف ہے۔

(۳) وہ الف کہ یَ سے بدلا ہوا ہے مصحف امام میں اس کی کتابت یِ سے کی گئی ہے - مثلاً یٰتَوْفیٰ یا حَسرتیٰ - ایسے ہی بغرض تفخیم بعض جگہ الف کو وَ کی صُورت میں لکھا ہے - جیسے صلوٰۃ زکوٰۃ وغیرہ - پس ممکن ہے کہ ایسے الفاظ کو کسی قاری نے اصل کلمہ اور کتابت دونو کی رعایت پر ادا کیا ہو - یعنے اس کو الف و ی کے بین بین پڑھا ہو - اس قسم کے تلفّظ کو یعنے فتح کو کسرہ کی طرف اور الف کو یَ کی جانب بہت زیادہ مائل کر کے پڑھنے کو اِمالہ کہتے ہیں۔

ایسے ہی بعض الفاظ ایک مقام پر ایک صُورت میں اور دُوسرے مقام پر دُوسری صورت میں لکھے گئے ہیں مثلاً مٰلک یوم الدین - مَلِكِ الناس - یخدعون یخادعون وعدنا واعدنا وغیرہ وغیرہ ناقص وادی کی واو بعض مقام پر الف سے لکھی گئی ہے - مثلاً اَلصَّفَا - شَفَا اور بعض دوسری جگہ اس کے خلاف ہے - مثلاً ضحیٰ - سجیٰ - طحیٰ - زکیٰ - وغیرہ - اسم منقوص سے اکثر مقامات پر یَ حذف ہوا ہے - جیسے باغٍ - ولا عادٍ - اِقضِ مَا اَنْتَ قاضٍ - ایسے ہی یائے متکلم کا حذف ہے - مثلاً اَطِیْعُوْنِ - دَعِیدِ - بالوادِ - وغیرہ وغیرہ پس کسی قاری نے ایسے الفاظ کو محض اصل کلمہ کے لحاظ پر پڑھا ہے - اور کسی نے اصل و کتابت دونو کی رعایت کے ساتھ اور کسی نے صرف کتابت کے لحاظ پر ادا کیا ہے - لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قرّا کو اس قسم کے تلفّظ میں کسی طرح کا شک تھا - یا یہ کہ انکو کوئی قرآن دان حافظ ایسا نہیں ملا تھا جس سے وہ اس قسم کے الفاظ کی صحت کر سکتے - نہیں بلکہ وہ لوگ قرآن مجید کو اصلی قرأت میں تو اپنے اساتذۂ قرآن دان سے پڑھ چکے تھے - بعد ازاں الفاظ قرآنی میں اور ان کے ماخذوں

اور اصلیت پر غور و تدبّر کرنے کے بعد اپنے اپنے قیاس سے وہ ان الفاظ کو خاص خاص طریق پر ادا کرنے میں کمال قرأت سمجھنے لگ گئے - اور جواز کے لئے یہ اصول بنا لیا گیا - کہ مُصحفِ امام ان قرأتوں پر مشتمل ہے - جن کا احتمال اس کی رسم الخط سے ہو سکتا ہے۔

ایسے ہی جب انہیں یہ ایک روایت مل گئی - کہ صفوان بن عسّال کہتے ہیں - کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (یا یحیی) کو امالہ کے ساتھ ادا فرمایا ہے - تو انہوں نے اس تلفّظ خاص کو قاعدہ کلیّہ قرار دے کر ایسے تمام کلمات میں فتح کو کسرہ کی طرف اور الف کو بجانب یَ مائل کر کے پڑھنا جایز ٹھہرا لیا - وغیرہ وغیرہ۔

لیکن چونکہ اس ساری بحث کا مبنی محض قیاس و خیال ہے - لہذا وحی متلو اور اجماعی قرأت کے مقابل میں ایسے حروف کی کچھ بھی حقیقت نہیں - جس لفظ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت امالہ کے ساتھ ادا فرمایا ہے - اس خاص لفظ کا اِمالہ تو صحیح ہو سکتا ہے - لیکن اس کے سوائے کسی دُوسرے لفظ کا قیاساً امالہ کرنا ہرگز جایز نہیں - کیونکہ قرآن شریف کی صحّت یعنے اس کے الفاظ کی صحت تلفظ کے یہ معنے ہیں - کہ جس انداز و طرز پر رسول کریم مہبط وحی کی زبان حق ترجمان سے نکلے ہیں - اس انداز پر ادا ہوں اور بس۔

بہرحال موجودہ قرأتوں کے پیدا ہونے یا رواج پانے کے کچھ ہی اسباب ہوں - اُن کے موجد خود صحابہ ہوں یا تابعین یا تبع تابعین ان قرأتوں کو سبعہ احرف والی قرأتیں کہنا ایک بلا دلیل دعوے ہے - اور بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے - کہ موجودہ قرأتیں سبعۂ احرف والی قرأتوں کی یادگار ہیں - تاہم جبکہ یہ ثابت ہے - کہ حضرت خلیفۃ المؤمنین عمرؓ ابن الخطاب نے اپنے عہد خلافت میں قریشی قرأت کے سوائے دوسری تمام قرأتوں کے ترک کا فتویٰ دیا ہے - (اپنی رائے - قیاس - یا اجتہاد سے نہیں بلکہ عرضۂ اخیرہ کی مختار قرأت نبوی پر عمل کرنے کے لئے) اور عام قاریوں کو غیر محاورۂ قریش پر قرآن پڑھانے کی ممانعت کی ہے - جیسیکہ ہم پچھلی بحثوں میں فتح الباری کی ایک روایت نقل کر آئے ہیں - کہ حضرت عمرؓ نے جب یہ سُنا - کہ ابن مسعود کوفہ میں لوگوں کو غیر محاورۂ قریش پر قرآن پڑھاتے ہیں - تو انہوں نے ابن مسعود کے نام فرمان جاری کیا - کہ:-

(فاقرئ الناس بلغة قریش ولا تقرئهم بلغة هذیل) مختصراً یعنی لوگوں کو محاورۂ قریش پر قرآن پڑھاؤ۔ لغۂ ہذیل پر ہرگز مت پڑھاؤ۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اسی تجویز پر عمل کیا۔ اور تنہا اپنی رائے سے نہیں۔ بلکہ ائمہ قراؓ اُبیؓ۔ ہشامؓ و حضرت علیؓ وغیرہم بلکہ تمام صحابہ کی مشورت ان کے اتفاق و اجماع سے یہ بات قرار پائی۔ کہ لوگوں کو ایک مصحف مجید پر جمع کیا جائے۔ یعنی عام قرأت کا مدار علیہ صرف ایک مصحف ٹھیرایا جائے۔ جو لغۂ قریش کے مطابق ہو۔ تاکہ آیندہ اختلاف قرأت نہ رہے۔ پھر ویسے ہی عمل ہوا۔ تو اب ہمیں ان سے اختلاف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

بعض سطحی نظر کے لوگ کہتے ہیں۔ کہ عہد عثمان میں صحابہ کا اجماع صرف کتابت مصحف اور اس کی رسم الخط پر ہوا ہے۔ وسعت قرأت کے خلاف کوئی اجماع نہیں ہوا۔ مگر یہ کہنا قلتِ تدبّر روایات پر مبنی ہے۔ وہ ایک خلیفۂ برحق حضرت عمر بن الخطاب و عثمانؓ رضی اللہ عنہما کے فرمان کی لغویت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ اللہ منہ۔ وہ یہ نہیں جانتے۔ کہ مصحف مجید تو پہلے بھی ایک ہی تھا۔ احرف کی اجازت کے بعد بھی ایک ہی رہا۔ پھر عہد عثمانؓ میں لوگوں کو مصحفِ واحد پر جمع کرنے کا کیا مطلب ہوگا کیا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ مصحف مجید میں تو حتّیٰ حین لکھا ہو۔ اور لوگ عتّیٰ حین بلغۂ ہذیل پڑھا کریں۔ اور کہا جائے۔ کہ ان کا یہ پڑھنا مصحف امام کے مطابق ہے۔ ہرگز نہیں یہ خیال بالکل غلط ہے۔ لوگوں کو مصحف واحد پر جمع کرنیکا مطلب یہ ہے۔ کہ جو کچھ مصحف مجید میں لکھا ہو۔ قرأت میں وہ ایسے ہی ادا ہو۔ تاکہ اگر دو شخص کلام مجید کے کسی لفظ کے پڑھنے یا اس کے تلفظ کے ادا کرنے میں اختلاف کریں۔ تو انہیں مصحف مجید کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ جس کی قرأت مصحف پاک کے مطابق ہو۔ وہی صحیح سمجھی جائے۔ الغرض جبکہ جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت نے (جس کا ایک ایک فرد صاحب اجتہاد تھا) بالاتفاق و بالاجماع عام احرف کو ترک کرکے قرآن شریف کی عام تعلیم کو صرف ایک محاورۂ قریش (قرأت نبوی) ہی میں محدود کر دیا ہے۔ باوجودیکہ وہ ہم سے زیادہ قرآن دان اور ماہر حقایق احرف تھے۔ اور پھر جن لوگوں کو اپنے اپنے

حروف پر قرآن کے پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے محاوروں کو چھوڑ کر قرأت قریش ہی پر قرآن مجید کا پڑھنا اختیار کر لیا۔ اور اس پر بھی تمام امّت کا اتفاق ہے۔ کہ صحابۂ کرام صاحب اجتہاد تھے اور ان کی رائے امور دین میں ہمیشہ صواب پر رہی ہے۔ تو پھر اب ہمیں از سر نو اجماع صحابہ کے برخلاف ان مہجورہ و متروکہ قرأتوں کے رواج دینے کی کیا ضرورت ہے۔ پس یہ قرآن شریف جو آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ وہی کلام مبارک ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ مدّت العمر آپ صلعم نے اس کی تلاوت فرمائی۔ نمازوں میں پڑھا۔ لکھوایا وہ جس طرح سبعہ احرف کی اجازت سے پہلے ایک تھا۔ اور قرشی لغۂ پر شامل تھا۔ اجازتِ احرف کے بعد بھی وہ ایک ہی ہے۔ اس اجازت سے اس میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی۔ نہ اسکی تحریر میں کوئی تغیر و فرق آیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اسی کو نمازوں میں پڑھا مصحف مجید میں جمع کرایا۔ جس کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے حرف بحرف کرائیں۔ اور اس کی تعلیم کی اجازت دی۔ مشرق سے مغرب۔ شمال سے جنوب تک اتنی وسیع دنیا میں اسقدر عرصۂ دراز کے درمیان ہزارہا مذہبی نزاعوں اور قومی اختلافوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایک نسخہ کلام مجید کا ایسا نہیں دکھایا جا سکتا۔ جس میں قرأت قریش کے سوائے دوسرے دوسرے کسی حرف کے ایک نقطہ کے اندراج کو جائز رکھا گیا ہو۔ مسلمانوں میں ایسے ایسے فرقے ہو گذرے ہیں۔ جو ایک دوسرے کی جان کے دشمن رہے ہیں۔ اور یہ بھی دعوے کیا ہے۔ کہ قرآن میں سے بعض حصص نکال دیئے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی اسی نسخۂ کلام مجید کو پڑھا۔ اور پڑھایا اس کے خلاف کوئی نسخہ قرآن پیش نہیں کیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سبعہ احرف والی قرأتیں ہوں۔ خواہ مروّجہ موجودہ قرأتیں کبھی کسی نے وحی متلو کے مقابل سمجھکر ان کو قرآن مجید کے اندر داخل نہیں کیا۔ کیا یہ وجوہات اس بات کے لئے کافی ثبوت نہیں ہیں۔ کہ اصل محاورہ کلام مجید کے سوائے دوسرے حروف کی خواہ کچھ ہی حقیقت ہو۔ کسی زمانہ میں وحی متلو کا ہم پلّہ نہیں سمجھے گئے۔ اور کسی قاری نے ان کو جزوِ کلام مجید متصور نہیں کیا۔ کیونکہ اگر وہ

اپنی قرأتوں کو مثل وحی متلو جزو کلام مجید سمجھتے۔ تو پھر انہیں اپنی قرأتوں کو اپنے نسخۂ کلام مجید میں لکھ لینے سے کون مانع تھا۔ پس مصحف امام کی قرأت (کہ در اصل قرأت نبی صلی اللہ علیہ وسلم وقرأت جبریل علیہ السلام وقرأت قدس ہے) متفق علیہ کے مقابل میں کسی دوسری قرأت کے قبول کرنے کے لئے اعلےٰ درجہ کی معتبر اور یقینی شہادت ہونی چاہیئے۔ وَالحقّ عند اللہ ٭

احرف کے متعلق محققین فقہاء و محدثین ومفسرین کا فتویٰ

مزید بصارت و اطمینانِ قلب کے لئے ذیل میں ہم چند محقق و مستند فقہاؤ محدثین ومفسرین کے اقوال نقل کرتے ہیں:۔

علامہ صاحب فتح الباری کا قول علامہ صاحب فتح الباری اپنی شرح بخاری میں لکھتے ہیں نَقَدْ ثَبَتَ اَنَّ وَرُوْدَ التَّخْفِیف بِذٰلِکَ کَانَ بَعْدَ الْھِجْرَتِ کَمَا تَقَدَّمَ فِیْ حدیث اُبَیّ ابن کعب اَنَّ جِبْرِیْلَ لَقِیَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ عِنْدَ اَضَاءَۃِ بَنِیْ غِفَارٍ الخ والاضاءۃ بنی غفار ھُوَ مُسْتَنْقَعُ الْمَاءِ کالغدیر وھو موضع بالمدینۃ النبویۃ۔ (فتح الباری جلد ۹ بحث باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف)

ترجمہ۔ روایات سے ثابت ہے۔ کہ قرأۃ کی تسہیل کا ورود ہجرت کے بعد ہوا ہے۔ جیسے کہ اُبی بن کعب کی حدیث میں بیان ہوا۔ کہ جبریل علیہ السلام جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (سبعہ احرف کی اجازت لیکر) آئے۔ آپ صلعم بنی غفار کے جوہڑ کے پاس تھے الخ پھر آگے لکھتے ہیں۔ اضاءہ جوہڑ میں نہانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور اضاءۃ بنی غفار مدینۂ نبوی میں ایک مقام کا نام ہے ؏

بغوی کا قول اَلْمُصْحَفُ الَّذِیْ اِسْتَقَرَّ عَلَیْہِ الْاَمْرُ ھو آخر العرضات علی رسول اللہ صلی اللہ عَلَیْہِ وسلم فامر عثمان بنسخہ فی المصاحفِ وجمع الناس عَلَیْہِ واذھب ما سوای ذالک قطعاً لمادۃ الخلاف فصار ما یخالفُ خطَّ المصحف فی حکم المنسوخ وَالمرفوع کسائرِ ما نُسِخَ وَرُفِعَ فلیسَ لاحدٍ اَنْ

یَعْدُدَ فِی اللَّفْظِ اِلٰی مَا ھو خارجٌ عَنِ الرَّسْمِ۔ (شرح سنہ) یعنے مصحف مجید جس پر اجماع ہوا۔ وہی مصحف ہے۔ جسکو جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ علیہ وسلم پر آخری مرتبہ میں پیش (دور) کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اسی مصحف کو مصاحف میں نقل کرنے کا حکم دیا۔ اور اسی کی قرأت پر لوگوں کو جمع کیا۔ اور اس کے سوائے دوسری تمام تحریروں کو (جن میں آیات لکھی ہوئی تھیں) قطع خلاف کے لئے ضائع کر دیا۔ پس وہ تمام قرأتیں جو اس مصحف امام کی رسم الخط کے مخالف ہیں۔ سب منسوخ ومرفوع کے حکم میں ہیں۔ مثل دوسرے احکام مرفوعہ ومنسوخہ کے۔ اب کسی کے لئے ایسے لفظ احرف کی طرف تجاوز کرنا ہرگز جائز نہیں۔ جو مصحف امام کی رسم الخط سے خارج ہے۔ (فتح الباری ناقلاً عن شرح السنہ)

علامہ احمد بن محمد کا قول علامہ احمد بن محمد اپنی شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔ وَھَلْ ھی باقیۃ الی الان یقرءبھا ام کان ذالک ثم استقر الامر علی بعضھا والی الثانی ذَھَبَ الاکثر کسفیان بن عُیَیْنَۃَ وابن وھب والطبری والطحاوی ؏
وھل استقرّ ذالک زَمَنِ النَّبَوِی ام بَعْدُ والاکثرُ علی الاول واختارہ القاضی ابوبکر بن الطیّب وابن عبد البرّ وابن العربی وغیرھم ؏
لان ضرورۃ اختلاف اللّغات ومشقۃ نطقھم بغیر لغتھم اِقْتَضَتِ التَّوَسَّعَۃَ عَلَیہِمْ فی اوّل الامر فاذن لکلٍ ان یقرء علی حرفہٖ ای طریقتہٖ فی اللغتہ الی اَنْ اَنْضَبَطَ الْاَمْرُ وَتَدَرَّبَتِ الْاَلْسُنُ وَتَمَکَّنَ النَّاسُ مِنَ الْاِقْتِصَارِ عَلَی الطَّرِیْقَۃِ الْوَاحِدَۃِ فَعَارَضَ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السّلام النبی صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وسلم القرآن مرّتین فی السَّنَۃِ الْاَخِیْرَۃِ واستقرّ علی ما ھو علیہ الان فنسخ اللّٰہ تعالٰی تِلکَ القرءۃ المَاذُوْن فِیْھَا بما اوجبہ من الاقتصار علی ھٰذہ القراءۃ الَّتِیْ تلقھا الناس (قسطلانی شرح بخاری جلد ۹ باب اُنزل القرآن بلسان قریش)

یعنے کیا وہ (سبعہ احرف والی قرأتیں) اب تک موجود ہیں۔ اور پڑھی جاتی ہیں۔ یا یہ کہ وہ ابتدائے امر میں رائج ہوئیں۔ اور پھر کسی ایک حرف کو اختیار کر لیا گیا۔ سفیان

بن عینیہ و ابن وہب طبری وطحاوی - اسی دوسری شق کے قائل ہیں - پھر آگے چلکر سبعہ احرف میں سے حرف واحد کی طرف رجوع کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ہوا ہے - یا بعد میں - اکثر اہل علم پہلی شق کے قائل ہیں - قاضی ابوبکر بن الطیب و ابن عبد البر و ابن عربی وغیرہم نے اسی کو اختیار کیا ہے - اس لئے کہ اختلاف محاورہ اور ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے لغۃ پر پڑھنے کی مشقت ابتدائے امر میں وسعت قرأت کی مقتضی ہوئی تھی جس پر ہر ایک قبیلہ کو اپنے اپنے محاورہ پر پڑھنے کی اجازت دیدی گئی - یہاں تک کہ قرأت صاف ہو گئی اور زبانیں منج گئیں - اور لغۃ واحدہ پر قرآن شریف کے پڑھنے پر لوگ قادر ہو گئے - تو نبوۃ کے آخری سال میں جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو مرتبہ قرآن پیش کیا (دور کیا) اور اس لغۃ پر قرآن قائم ہوا جس پر وہ آجکل موجود ہے - پس اللہ تعالٰے نے باقی ان تمام قرأتوں کو جن پر پڑھنے کی اجازت دی تھی - اس قرشی لغۃ کے مختار ہونے کے باعث منسوخ کردیا - (قسطلانی شرح بخاری جلد ۹)

ابن جریر طبری کا قول طبری لکھتے ہیں - اگر کوئی کہے - کہ حرف قریش کے سوائے دوسرے حروف جو اب قرآن میں نہیں پائے جاتے - کیونکر ترک کردیئے گئے - حالانکہ ان کی تعلیم بواسطہ وحی عمل میں آئی تھی - تو ہم کہیں گے - الامۃ اُمرت بحفظ القرآن وقرأتہ وخُیّرت فی قرأتہ بای الاحرف السبعۃ شاءت - فرأت لعلّۃٍ من العلل اوجبت علیہا الثبات علی حرفٍ واحدٍ قرأتہ بحرفٍ واحدٍ ورفض القرأۃ بالاحرف الستۃ الباقیۃ ورأت فیما فعل من ذالک الرشد والھدایۃ فترکت القرأۃ بالاحرف الستۃ التی عزم علیہا امامہا العادل فی ترکہا طاعۃً منہا لہ ونظرًا منہا لانفسہا ولمن بعدہا من سائر اھل ملّتہا حتی درست من الامۃ معرفتہا وتعفّت آثارہا فلا سبیل لاحدٍ الیوم الی القرأۃ بہا من غیر جحودٍ منہا صحتہا - فلا قرأۃ الیوم للمسلمین الا بالحرف الواحد الذی اختارلہم امامہم وشفیقہم الناصح دون ماعداہ من احرف الستۃ

الباقیۃ - فلم یکن القوم بترکہم نقل جمیع القرأت السبع تارکین ما کان علیہم نقلہ بل کان الواجب علیہم من الفعل ما فعلوا (تفسیر ابن جریر جلد ۱)

یعنے امۃ کو قرآن کے حفظ اور اس کی قرأت کا حکم ہو - اور یہ اختیار دیا گیا - کہ سبعہ احرف میں سے جس حرف پر چاہیں - قرآن پڑھیں - پھر کسی مانع کو دیکھ کر اُمت نے ایک حرف کی قرأت کو اختیار کرکے باقی چھ حروف کی قرأۃ ترک کردی ۔

آگے چلکر - پھر اُمت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس کارروائی میں رُشد و ہدایت کو دیکھ کر اپنی خوشی سے ان چھ حروف کی قرأۃ ترک کردی - جس کے ترک کا ارادہ امام عادل نے ظاہر فرمایا - یہاں تک کہ وہ متروکہ حروف بالکل بھول گئے - اور اس کے آثار و علامات تک بھی مٹ گئے - اب ان حروف پر پڑھنے کی کوئی سبیل نہیں - اس لئے کہ وہ بالکل مٹ چکے ہیں - اور اس سبب سے کہ یکے بعد دیگرے مسلمان ان کی قرأت ترک کرتے چلے آئے ہیں - باوجودیکہ ان حروف کی صحت پر کسی کو انکار نہیں تھا - لہذا اس وقت تمام مسلمانوں کی قرأت اسی حرف واحد پر ہے - جسے اُمت کے شفیق و ناصح امام نے اختیار کیا ہے - سوائے ان متروکہ چھ حروف کے -

آگے چلکر - احرف کی اجازت بطریق رخصت تھی - اور اُمت مخیر تھی کہ جس حرف پر چاہے قرآن پڑھے - پھر جب اس نے حرف واحد (لغۃ قریش - اصل محاورۂ تنزیل) پر اجماع کرلیا - تو اس کو باقی حروف کے ترک پر تارکین احرف نہیں کہا جاسکتا - بلکہ اُمت پر ان حروف کا ترک کرنا ہی ضروری تھا - (فلم یکن القوم بترکہم نقل جمیع القرأت السبعہ تارکین ما کان علیہم نقلہ بل کان الواجب علیہم من الفعل ما فعلوا)

(خلاصہ تفسیر ابن جریر جلد ۱)

قاری ابو شامہ کا قول قال ابو شامۃ ظنّ قومٌ انّ القرأت السبع الموجودۃ الان ھی التی اُریدت فی الحدیث وھو خلاف اجماع اھل العلم قاطبۃً انما یظنّ ذالک بعض اھل الجھل -

واما من ظنّ انّ قرأۃ ھؤلاء القرّاء کنافع وعاصم ھو الاحرف

السبعۃ التی فِی الحَدِیثِ فَقَد غَلَطَ غَلَطاً عَظِیماً (فتح الباری)

یعنی ابو شامۃ[1] کہتے ہیں۔ ایک قوم کا ظن ہے۔ کہ یہ سات قرائتیں جو آجکل رائج ہیں۔ وہی سبع قرأت ہیں۔ جو احرف کی حدیث سے مراد لی گئی ہیں۔ حالانکہ یہ خیال یقیناً اہل علم کے اجماع کا برخلاف ہے۔ بلکہ یہ خیال جہلا کا ہے۔ آگے چلکر جس نے یہ خیال کیا۔ کہ مثلاً قاری نافع وعاصم وغیرہ قاریوں کی قرائتیں۔ سبعہ احرف والی قرائتیں ہیں۔ پس اس نے سخت غلطی کی ہے۔ (فتح الباری ناقلاً عن ابو شامہ)

علامہ صاحب مشکل الآثار کا قول فاضل طحاوی لکھتے ہیں۔ وَکَانَ فِیمَا ذَکَرنَا مَا قَد دَلَّ اَنَّ مَن اَضَافَ شَیئاً مِمَّا یُخَالِفُ مَا فِی مُصحَفِنَا ھٰذَا اِلٰی اَحَدٍ مِن اَصحَابِ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ فَغَیرُ مُلتَفَتٍ اِلٰی مَا حَکٰی لِاَنَّہٗ حَکٰی مَا لَا یَقُومُ بِہِ الحُجَّۃُ (مشکل الآثار طحاوی)

یعنی ہم نے جو بیان کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص ایک ایسی قرأت کسی اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرے۔ جو اس ہمارے مصحف کی قرأت (لغۃ قریش) کے خلاف ہے۔ تو اس کی بات نہ مانی جائے گی۔ کیونکہ اس نے ایسی بات بیان کی ہے۔ جس سے حجّۃ نہیں ہو سکتی۔ (طحاوی)

اس کے سوائے اور بھی بہت سے محققین کی عبارتیں اور ان کے اقوال ہمارے پاس موجود ہیں۔ لیکن بخوف طوالت ہم انہیں درج نہیں کرتے۔ اس لئے کہ اثبات دعویٰ کے لئے اس سے زیادہ شہادت کی ضرورت نہیں۔ وَالحَقُّ عِندَ اللّٰہِ۔

قرآن مجید کی رسم الخط اور اُس کی کتابت

ہم اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کہ عربی تحریر کا کون موجد ہے۔ اور وہ کب سے قایم ہوئی ہے۔ بہرحال جب کلام مجید کا نزول ہوا ہے۔ اس وقت اہل عرب

[1] ابو شامۃ یعنی علامہ شہاب الدین ابو القاسم عبد الرحمٰن بن اسمٰعیل بن ابراہیم مقدس دمشقی۔ قاری سخادی کے شاگردوں سے ہیں۔ فن قرأۃ میں آپ کے تصانیف مستند مانے جاتے ہیں۔ (رجال)

لکھنے پڑھنے میں کامل مشّاق تھے۔ اور ان کی تحریر و کتابت خواہ کسی اصول پر ہو مضمون کے ادا کرنے میں نہایت شُستہ اور مستحکم تھی۔

اہل تاریخ کا خیال ہے۔ کہ عربی خط۔ خط سریانی (منسوب بہ سوریا یعنی شام سے ماخوذ ہے۔ اور اہل یمن اس کے واضع ہیں۔ جو اپنی تجارتی ضروریات کے باعث شام میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت ہے۔ کہ وہ فرماتے ہیں۔ عربی خط کی ایجاد تین شخصوں نے کی ہے۔ مرار نے حروف کی شکلیں ایجاد کیں۔ اسلم نے باہمی جوڑ ملانے کا طریقہ اور عامر نے نقطے اور حرکتیں قایم کیں۔ ابن خلدون لکھتے ہیں۔ دولت تبابعہ کے عہد میں خط عربی ضبط استحکام میں اعلےٰ درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ اس خط کا نام خط حمیری ہے۔ وہاں سے یہ خط حیرہ میں منتقل ہو کر خط حیری کے نام سے موسوم ہوا۔ وہاں سے مکّہ و طائف والوں نے سیکھا۔ اور نزول کلام مجید کے زمانہ میں اہل مکہ لکھنے پڑھنے میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ اور نقطے واعراب بھی عربی خط کے ساتھ ہی ایجاد ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ خط جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مقوقس والئی اسکندریہ کے نام لکھوایا تھا۔ (جو اس وقت صومعۂ مصر سے منتقل ہو کر اب دار السعادۃ میں موجود ہے۔ جس کے اصلی ہونے میں کچھ بھی شک نہیں۔ اہل یورپ کہتے ہیں کہ یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص میر منشی (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کا لکھا ہوا ہے جس کی متعدد عکسی نقلیں لی گئی ہیں) اس خط مبارک میں برابر نقطے لکھے ہوئے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ زمانہ نزول کلام مجید میں عربی خط نقطوں وغیرہ ضروریات خط سے بالکل آراستہ و پیراستہ تھا۔ البتہ کبار عرب چونکہ فن کتابت کو مثل خیاطت و صباغت و حیاکت حقیر پیشہ تصوّر کرتے تھے۔ اور اسے خصوصیات غلاموں میں سے شمار کرتے تھے۔ اس لئے وہ اسمیں چنداں مہارت پیدا نہیں کرتے تھے اور خاص ضرورت کے سوائے حرکتوں کے استعمال کو بھی ناپسند رکھتے تھے۔ اور اہل عرب کیلئے اس کی چنداں حاجت بھی نہ تھی۔ لیکن بعد میں جب عجم کی زبان پر قرآن

پڑھا جانے لگا۔ تو اعراب اور نقطوں کی ضرورت محسوس ہوئی (انتہی)

سب سے پہلے نصر بن عاصم و ابو الاسود دؤلی نے بحکم عبد الملک بن مروان ایسے کلام مجید لکھے۔ جس میں بالاستیعاب نقطوں اور حرکتوں کا خیال رکھا گیا۔ اسی وجہ سے عوام میں یہ مشہور ہے۔ کہ نصر بن عاصم کوفی اور ابو الاسود نقطوں اور حرکتوں کے موجد ہیں۔ بعد میں علامہ خلیل بن احمدؒ نحوی نے اعراب کی شکلوں میں اصلاح کی ؎

کلام مجید کے حروف کی موجودہ شکلیں بعینہ لوح محفوظ کی شکلیں ہیں

پس جب کلام مجید کا نزول ہوا۔ اور اس کے الفاظ و کلمات پر کتابت کا لباس پہنایا گیا۔ اور اس پر بزمانِ رسالت حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم (جو کہ نزول وحی کا زمانہ ہے) کسی طرح کا اصلاحی تغیّر واقع نہیں ہوا۔ تو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ بیشک جس لفظ یا حرف کی جو شکل قائم ہوئی ہے۔ بعینہ وہ لوحِ محفوظ کی شکل ہے۔ جسکو تقدیرِ الٰہی نے اپنی قدرت کے ہاتھوں سے نقش کیا ہے۔ اور اس کے سوائے کسی دوسری شکل کا اس کے لئے قائم کرنا بالکل غلط اور بے معنی ہے۔ مصحف مجید میں جہاں کہیں ایک لفظ دو مقاموں میں دو مختلف صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ اس کے اختلافِ صورت میں ایک سربستہ راز ہوتا ہے۔ جسے ہر ایک ظاہر بین شخص سمجھ نہیں سکتا ؎

ابو العباس کا قول

صاحب اتقان ابو العباس مراکشی کی کتاب عنوان الدلیل فی مراسم خطّ التنزیل سے نقل کرتے ہیں۔ کہ ایک لفظ کی مختلف صُورتیں اس کے معنے کے اختلاف کی مظہر ہوتی ہیں۔ یعنے ان حروف کے لفظی اختلاف کا باعث ان کے کلمات کا معنوں میں مختلف ہونا ہے۔ یعنے جس جگہ ایک کلمہ کے ایک معنے مراد ہیں۔ وہاں اس معنے کے مطابق اس کا لفظ رکھا گیا ہے۔ اور جس مقام پر وہ معنے بدل گئے ہیں۔ وہاں اس کی لفظی صُورت بھی بدلی ہوئی ہے۔ (انتہی از اتقان)

امام مالکؒ کا ارشاد رسم الخط کے متعلق

مصحف امام کے اس رسم الخط کے متعلق جو بظاہر علمائے نحو کے مقرر کردہ اصول کے خلاف ہے۔ امام مالکؓ سے پوچھا گیا۔ کہ آیا مصحف مجید کو

اس مصطلحہ قواعد ہجا کے موافق لکھنا چاہیئے۔ تو امام نے جواب دیا "کہ نہیں"۔ بلکہ اس کو اسی پہلی کتابت کے انداز پر لکھنا چاہیئے۔ اس قول کو الدّانی نے المقنع میں اشہب سے روایت کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے کہا۔ کہ اس قول کا علمائے امّت میں سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا ؎

اس راوی نے دوسری جگہ بیان کیا ہے کہ امام مالک رضی اللہ عنہ سے واؤ۔ اور الف کی مانند قرآن شریف میں سے حذف کرنے کی نسبت پوچھا گیا۔ کہ آیا تمہاری رائے ہے۔ کہ اگر مصحف میں اس طرح پایا جائے۔ تو اس کو متغیّر کر دینا چاہیئے۔ امام نے جواب دیا۔ ہرگز نہیں۔ ابو عمرو کہتا ہے۔ اس سے وہ واؤ اور الف مراد ہیں۔ جو مصحف مجید کی رسم الخط میں زاید ہیں۔ اور تلفّظ میں اُن کی آواز نہیں آتی۔ مثلاً اُولوا میں واقعہ شدہ واؤ اور الف ؎

امام احمدؒ کا فتوے رسم الخط کے متعلق

اور امام احمدؒ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ واؤ۔ الف۔ یٰ وغیرہ کے بارے میں مصحف عثمانی کی رسم الخط کی مخالفت حرام ہے ؎

بیہقی شعب الایمان میں لکھتے ہیں۔ جو شخص مصحف کو لکھے۔ اس کے لئے سزاوار ہے۔ کہ وہ انہی حروف تہجی کی حفاظت کرے۔ جس کے ساتھ صحابہ کرام نے ان مصاحف کو لکھا ہے۔ اور اس میں ان سے خلاف نہ کرے۔ اور ان کی لکھی ہوئی چیزیں میں سے کسی شئے کو متغیّر نہ کرے۔ اس واسطے کہ وہ لوگ بہ نسبت ہمارے بہت زیادہ علم رکھتے تھے۔ ان کے قلب اور ان کی زبانیں بہت صادق تھیں۔ وہ امانت میں ہم سے بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ کبھی مناسب نہیں۔ کہ ہم اپنے آپ کو ان کی کمی کو پورا کرنے والا گمان کریں ؎

رسم الخط کے خلاف پر تازیانہ کی سزا

یزید بن حبیب سے مروی ہے۔ کہ عمرو بن العاص (والی مصر) کے کاتب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھتے ہوئے اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سین کو ظاہر نہ کیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اس کو تازیانہ کی سزا دی ؎

مُصحف امام کی رسمُ الخط میں مندرجہ ذیل چھ۶ اصُول قابل غور ہیں :۔

(۱) حذف (۲) زیادتی۔ (۳) ہمزہ لانا (۴) بدل ڈالنا۔ (۵) وصل کرنا اور فصل ڈالنا۔ (۶) وہ لفظ جس میں دو قرأتیں آئی ہیں۔ مگر ایک لکھی گئی ہے۔

اصل اوّل حذف

الف مندرجہ ذیل مقامات سے اکثر حذف ہوتا ہے:۔

(۱) ۔یا حرف ندا سے ۔یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ ۔ یٰاٰدَمُ ۔یٰعِبَادِیْ ۔ یٰمُوْسٰے۔

(۲) ۔ھائے تنبیہ سے ۔مثل ھٰٓؤُلَآءِ ۔ ھٰاَنْتُمْ۔

(۳) ۔ نا ضمیر متکلم سے بمعیّت ضمیر دوم ۔اَنْجَیْنٰکُمْ ۔ حَشَرْنٰھُمْ ۔حَفَفْنٰھُمَا ۔ اَنْزَلْنٰہُ۔

(۴) حرف لام کے بعد واقعہ ہونے والا ۔ لٰکِنْ ۔ اُولٰٓئِکَ ۔خِلٰفَ ۔سَلٰمٌ ۔ اِیْلٰفِ ؛

(۵) دو لاموں کے درمیان واقعہ ہونے والا ۔خِلٰلَہٗ ۔ خِلٰلَ الدِّیَارِ۔

(۶) تین حرف سے زائد حرف والے علم میں واقع ہونے والا ۔ اِبْرٰھِیْمَ ۔اِسْمٰعِیْلَ ۔ اِسْحٰقَ ۔ مِیْکٰلَ ۔ رَحْمٰن مگر جالوت ۔ ھامان ۔ ھاروت وماروت یاجوج ماجوج بھی آئے ہیں ؛

اور داؤد میں سے اسلئے حذف نہیں ہوا ۔ کہ اس کا واؤ حذف ہو چکا ہے اور اسرائیل میں سے ی حذف ہوا ہے ؛

حرف ی کا حذف ۔ یہ حرف اکثر ایسے اسم منقوص سے حذف ہوتا ہے۔ جو کہ مُنوّن ہو۔ رفعاً یا جرّاً ۔ مثل باغٍ ۔عادٍ ۔اِقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؛ اور اکثر جگہ اطیعون ۔ خافون ۔ ارھبون ۔ اُعْبُدُوْنِ سے بھی حذف ہوا ہے۔ ایسے ہی اخشون ۔کِیْدُوْنِ ۔ کَذِّبُوْنِ ۔وَعِیْدِ ۔ بالوادِ ۔

یَھْدِیْنِ وغیرہ سے بھی ؛

حرف واؤ کا حذف واؤ ۔ دوسری واؤ کے ساتھ مثل مقامات ذیل میں حذف ہوئی ہے ۔ لَایَسْتَوٗنَ ۔فَاْوٗا ۔ یَؤُسًا وغیرہ ؛

حرف لام کا حذف ۔ لام مدغم اپنے مثل میں ۔مثل الذی ۔ اَلَّھْوَ ۔اَلَّغْوَ ۔

اصل دوم۔زیادتی

اسم مجموع کے آخر میں واؤ جمع کے بعد ایک الف زاید لکھا جاتا ہے۔مثل بنوا اسرائیل ۔مُلٰقُوا۔

لیکن جمع مرفوع و منصوب کے آخر میں بعض مقامات پر الف نہیں لکھا گیا ۔اور بعض جگہ لکھا گیا ہے ۔مثل عتوا ۔ فاءو ۔عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَعْفُوَا عَنْھُمْ سعوا فی اٰیٰتنا ۔ جاؤا۔

ہمزہ کے بعد یَ کی زیادتی مثل نَبَاْیِ الْمُرْسَلِیْنَ ۔ اِنَآیِ الَّیْلِ ۔ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ

ہمزہ کے بعد واؤ کی زیادتی ۔مثل سَاُوْرِیْکُمْ ۔ اُولوا ۔

اصل سوم۔ہمزہ لانا

(۱) ہمزہ ساکن اپنے ماقبل کی حرکت کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ اوّل کلمہ میں واقعہ ہو خواہ وسط میں خواہ آخر کلمہ میں مثلاً ۔ اِیْذَنْ ۔ اُؤْتُمِنَ اَلْبَأْسَآءُ ۔اِقْرَاْ ۔جِئْنٰکَ ۔

(۲) ہمزہ متحرک اگر اوّل کلمہ میں ہے یا اُس کے ساتھ کوئی حرف متصل ہوا ہے ۔اس کی کتابت مُطلقاً الف کے ساتھ ہوگی ۔یعنے اس کی کتابت حرکت کے اعتبار پر نہ ہوگی مثلاً اَیُّوبَ ۔ اِذَا ۔ اُکُوا ۔ سَاَصْرِفُ ۔ فَبِاَیِّ ۔ سَاُنْزِلُ ۔ اور بعض جگہ اس کے خلاف حرف یَ پر بھی ہوئی ہے ۔ اَئِنَّکُمْ اَئِنَّا لَتَارِکُوا ۔ اَئِذَا مِتْنَا یَوْمَئِذٍ وغیرہ ۔ اور بعض بصورت واو ہے ۔مثل ھٰٓؤُلَآءِ ۔ اُؤُنَبِّئُکُمْ

ایسے ہی ہمزہ متحرک اگر وسط کلمہ میں یا آخر کلمہ میں واقعہ ہے ۔ تو عموماً اس کی حرکت ہمزہ کے موافق حرف سے کی جاتی ہے ۔ مثلاً سَاَلَ سُئِلَ سَبَاٍ شَاطِئُ لُؤْلُؤٌ اور بعض جگہ اس کے خلاف ہے ۔مثل تَفْتَؤُا اَتَوَکَّؤُا نَبَؤُا ۔

اصل چہارم ۔ بدل ڈالنا

بغرض تفخیم الف کو واؤ سے بدل دیتے ہیں ۔ مثل صلوٰۃ ۔ زکوٰۃ ۔ حیوٰۃ ۔ ربوٰ ۔ بشرطیکہ یہ کسی اور اسم کیطرف مضاف نہ ہوں ۔ ایسے ہی بعض مقامات پر الغدٰوۃ ۔ مشکوٰۃ النجاۃ ۔ مناۃ کو بھی الغدوٰۃِ ۔ مشکوٰۃِ ۔ النجوٰۃِ ۔ منوٰۃِ یعنے الف واؤ کی شکل میں لکھا ہے ؛

(۲) وہ الف کہ حرف ی سے بدل ہوکر آیا ہے ۔ کتابت میں ی سے بدل جاتا ہے مثل یتوفّٰیکُمْ ۔ یہ صورت اسم یا فعل میں ہوتی ہے اس کے ساتھ ضمیر ہو یا نہ ہو ۔ اور کسی ساکن سے ملاقی ہو خواہ نہ ہو ۔ اس نوع سے یاحَسْرَتٰی یا اَسَفٰی اور بعض اس سے مستثنےٰ ہیں ۔ مثل تترا ۔ کِلتا ۔ ھَدَانِی ۔ عَصَانی ۔ ایسے ہی اِلیٰ ۔ علےٰ اَنّٰی ۔ متٰی ۔ بلےٰ ۔ حتّٰی وغیرہ ہیں ؛

ثلاثی کلمہ اسم یا فعل ناقص واوی ہونے کی حالت میں عموماً اس کا واؤ الف سے لکھا گیا ہے ۔ مثلاً اَلصَّفَا ۔ شَفَا ۔ اور بعض جگہ اس کے خلاف ہے جیسے ضحٰی ۔ سجٰی ۔ طحٰی ۔ زکٰی ۔ دحٰی ۔ طغٰی وغیرہ ؛

اصل پنجم ۔ وصل و فصل

اَلَّا (فتح کے ساتھ) عام طور پر بطریق وصل لکھا گیا ہے ۔ مگر دس مقام اس سے مستثنیٰ ہیں ۔ اَنْ لا اقول ۔ اَنْ لا تقولوا ۔ (اعراف) اَنْ لا مَلْجَاءَ (ہود) اَنْ لا اِلٰہَ ۔ اَنْ لا تَعْبُدُوا اِلَّا اللہ ۔ اِنّی اَخَافُ اَنْ لا تُشْرِكَ (الحج) اَنْ لا تَعْبُدُوا (یٰسین) اَنْ لا تَعْلُوْا (دخان) اَنْ لا یُشْرِکْنَ (ممتحنہ) اَنْ لا یَدْخُلَنَّھَا (ن)

ایسے ہی مِمَّا ۔ مِمَّنْ ۔ عَمَّا ۔ اِمَّا ۔ عَمَّنْ ۔ اَمَّنْ ۔ اَلَّمْ کہیں بطریق وصل اور کہیں مِنْ مَا ۔ مِنْ مَنْ ۔ عَمْ مَا ۔ اِمْ مَا ۔ عَنْ مَنْ ۔ اِمْ مَنْ ۔ اِنْ لَمْ کہیں بطریق فصل لکھے ہیں ۔ ایسے ہی کُلَّمَا ۔ بِئْسَمَا ۔ نِعِمَّا ۔ رُبَمَا ۔ کَاَنَّمَا ۔ اَیْنَمَا بھی کہیں فصل اور کہیں وصل کے ساتھ آئے ہیں ۔

اصل ششم ان الفاظ کی کتابت جن میں دو قرائتیں (لغتہ قریش میں)

آئی ہیں اور ایک ضبط ہوئی ہے اور قرأت سے مراد مشہور و مطرد ہے مثل مٰلِكِ ۔ یُخٰدِعُوْنَ ۔ وٰعَدْنَا ۔ حالانکہ ان کی قرأت الف و بلا الف دونوں کے ساتھ آئی ہے ؛

حصص کلام مجید

قرآن مجید کا نصف باعتبار تعداد حروف کے سورہ الکہف کے نُکْرًا کے ن پر ہوتا ہے ۔ اور حرف کَ دوسرے نصف کا آغاز ہے ۔ لیکن مشہور قول کے مطابق وَلْیَتَلَطَّفْ کی فَ پر نصف اوّل ختم ہوتا ہے ؛

اور تعداد کلمات کے لحاظ سے وَالْجُلُوْدُ (سورہ حج) پر نصف اوّل ختم ہوتا ہے ۔ اور وَلَھُمْ مَقَامِعُ دوسرے نصف کا شروع ہے ؛

تعداد آیات کے لحاظ سے سُوْرَۃُ الشُّعَرَاءِ کے قولہ یَاْفِکُوْنَ کی یَ پر اور دوسرے نصف کا آغاز فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سے ہوتا ہے ۔

سورتوں کی تعداد کے لحاظ سے سورۃ الحدید پر پہلی آدھی سُورتیں تمام ہوتی ہیں اور سُوْرَۃُ المجادلہ باقی نصف سورتوں کی پہلی سورت ہے ؛

سُورتوں اور آیتوں کی تعداد

بالاجماع سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) ہے اور آیتیں بالاتفاق چھ ہزار (۶۰۰۰) ہیں ۔ آیتوں کی تعداد میں اختلاف ہے ۔ اور وجہ اختلاف کی یہ ہے ۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب کلام مجید تلاوت فرماتے تو آیات پر وقف فرماتے تھے ۔ جس سے سامعین کو محل وقف معلوم ہو جاتا تھا ۔ بعض موقعہ پر آپ صلعم نے دوسری مرتبہ تلاوت کرتے وقت وقف نہیں فرمایا ۔ یعنے ایک ہی سانس میں دو آئتیں متصل تلاوت فرمائی ہیں لہذا ایسی آیتوں کو بعض حضرات نے علیحدہ علیحدہ آیات شمار کیا ہے ۔ اور بعض نے ان کو ایک آیت قرار دیا ہے ۔ حضرت ابن عباس رضؓ چھ ہزار دو سو سولہ ۶۲۱۶ آئتیں شمار کرتے

ہیں - اور ایک قول میں چھ ہزار دو سو چار بھی ہیں (۶۲۰۴) قرآن شریف کے کلمات (۷۷۹۳۴) ہیں - اور حروف (۳۲۳۰۱۵) ہیں ؎

رُمُوزُالقرآن (وقف اور ابتداء)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرامؓ کا یہ مسلک رہا ہے - کہ قرآن پڑھتے وقت آیات پر ٹھہرا کرتے تھے - اور آیت کے بیچ میں ٹھہرنے کے متعلق کوئی پختہ روایت نہیں آئی - مگر اس طرز کو صرف اہل عربیت ہی پورا کر سکتے تھے - عجم سے اس کا ادا ہونا مشکل تھا - نافعؒ قاری پہلے شخص ہیں - جنہوں نے پوری آیت کے سوائے آیت کے بیچ میں ٹھہرنے کی اجازت دی - بشرطیکہ معنوی رعایت قائم رہے - یعنے وقف کرنے سے معنوں میں بے ربطی نہ پیدا ہو - قاری حمزہؒ نے یہ بھی اجازت دے دی - کہ جہاں سانس ٹوٹ جائے وہاں وقف کر لینا جائز ہے - ابن الجزری لکھتے ہیں - جہاں تک ایک کلمہ کا دوسرے کلمہ کے ساتھ اتصال چلا جاتا ہے - اس کے ضمن میں ٹھہرنا گویا کلمہ کو ادھورا چھوڑنا ہے - کیونکہ وقف اور ابتدا کو معانی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے - لیکن چونکہ عوام پر ان رعایتوں کے ساتھ قرآن مجید کا پڑھنا مشکل تھا - لہٰذا ائمہ قرأ مثل ابو جعفرؒ نافعؒ - عاصمؒ وغیرہ نے بغرض سہولت تلاوت وقف کے مقامات معیّن کر دیئے - اور اس کی تین قسمیں قرار دیں ؎

ابن انباری لکھتے ہیں - وقف تین قسم پر ہے - تامؔ - حسنؔ - قبیحؔ -

(۱) وقف تام وہ ہے - جس پر ٹھہر کر سانس لینا اور پھر اس کے بعد سے ابتدا کرنی اچھی ہو - اور اس وقف کا مابعد اس سے کوئی تعلّق نہ رکھتا ہو - مثلاً قولہٗ - جَعَلُوْٓا - اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ - اَذِلَّةً کیونکہ یہاں بلقیس کا کلام ختم ہوتا ہے - اور اس کے بعد وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ بالکل جداگانہ جملہ ہے ؎

(۲) وقف حسنٌ - یہ وہ مقام ہے - جہاں ٹھہرنا تو اچھا ہے - مگر اس کے بعد سے ابتدا کرنی اچھی نہ ہو - جیسے قولہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ - کہ اس کے بعد ربّ العٰلمین سے ابتدا کرنی

یوں اچھی نہیں - کہ وہ اپنے ماقبل کی صفت ہے ؎

(۳) وقف قبیح یہ وہ وقف ہے - کہ نہ تام ہو - اور نہ حسن مثلاً بسم اللہ میں صرف بسم پر ٹھہرنا - ایسے ہی مضاف الیہ کو چھوڑ کر صرف مضاف پر موصوف کو چھوڑ کر صرف صفت پر مرفوع کو چھوڑ کر رفع دینے والے حرف پر یا اس کے برعکس ایسے ہی ناصب پر بلا اس کے منصوب کے موکّد پر بلا اس کی تاکید کے بدل پر بلا اس کے مبدل منہ کے ملائے ہوئے اس قسم کے تمام وقف نادرست ہیں ؎

ایسے ہی اِنَّ - کَاَنَّ - ظَنَّ اور اس کی مانند کلمات کے اسم پر بغیر اس کی خبر کے اور خبر پر بغیر اس کے اسم ملائے کے وقف کرنا صحیح نہیں - اسی طرح مستثنیٰ - موصول - شروط پر بغیر ان کے متعلقات ملانے کے وقف نہیں کرنا چاہیئے ؎

سجاوندی لکھتے ہیں - وقف کے پانچ مرتبے ہیں - لازمؔ - مطلقؔ - جائزؔ - مرخّصؔ - مجوّزؔ

(۱) لازم وہ ہے - کہ اگر اس پر وقف نہ ہو - تو معنے میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے - جیسے قولہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (وہ لوگ مومن نہیں ہیں) اگر اس پر وقف نہ کریں - اور يُخٰدِعُوْنَ سے ملا کر پڑھیں - تو یہ معنے ہونگے - (وہ لوگ ایسے مومن نہیں ہیں - جو خدا کو دھوکہ دیتے ہیں) حالانکہ مقصود یہ بیان کرنا ہے - کہ وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں) اور خدا کو دھوکہ دیتے ہیں ؎

(۲) جائز یہ وہ وقف ہے - جہاں از روئے معنے ٹھہرنا اور نہ ٹھہرنا دونو برابر ہیں - جیسے قولہ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (ج) دِيْنًا قِيَمًا اس کی علامت ج ہے ؎

(۳) مطلق وہ وقف ہے - جس کے بعد ابتدا اچھی معلوم ہوتی ہے - جیسے حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ؕ اس کی علامت ط ہے ؎

(۴) مُرخّص وہ وقف ہے - جہاں مابعد ماقبل سے مستغنی نہ ہو - لیکن ضرورتاً مثلاً سانس لینے کے لیے وقف کی حاجت ہو - اس کی علامت صؔ ہے ؎

(۵) مجوّز - جہاں اتصال کا موقعہ ہو - لیکن کوئی خاص سبب انفصال کا خواہاں ہو جائے جیسے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ - فَلَا يُخَفَّفُ

کا حرف فَ اس بات کا مقتضی ہے۔ کہ یہ ماقبل کی جزا ہو۔ جس کی وجہ سے ان میں باہم اتصال ہے۔ لیکن فصل استیناف کا خواہاں ہے؛

اس کے علاوہ اور بھی بعض علامتیں وقف کی ہیں۔ مثلاً جب دو وقف قریب آجاتے ہیں۔ تو ان کو معانقہ کہتے ہیں۔ جیسے قولہ لَا رَیْبَ ۔ ج ۔ فِیْہِ ۔ ج ۔

(سکتہ) یہ بھی ایک علامت ہے۔ قرآن مجید میں سات آٹھ ایسے مقامات ہیں جہاں جھٹکے کے ساتھ پڑھنے سے خوف ہوتا ہے۔ کہ حرکت ضائع ہوجائیگی۔ اس لئے سانس نہیں لیتے۔ بلکہ آہستگی اور سکون کے ساتھ اس کو ادا کرتے ہیں۔ جیسے قولہ تعالےٰ یُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ ط

(لا) جن آیتوں پر لا لکھا ہوتا ہے۔ وہ ان آیتوں کے زیادتی اتّصال کی علامت ہے۔ جس سے یہ مقصود ہوتا ہے۔ کہ یہاں وقف نہ کرنا چاہئے۔ اور اگر سانس ٹوٹ جائے تو پھر از سرِ نو ملا کر پڑھنا چاہئے؛

ایسے ہی وقفہ ۔ صَلْ ۔ صلّٰی بھی منع کی علامتیں ہیں؛

ضابطہ ۔ جہاں کلام مجید میں اَلّذِی اور اَلَّذِیْنَ آیا ہے۔ ان میں دو صُورتیں جائز ہیں۔ (۱) نعت قرار دے کر ماقبل کے ساتھ وصل کردیں۔ (۲) خبر ٹھہرا کر اسے ماقبل سے جدا کرکے پڑھیں۔ مگر سات مقام اس قاعدے سے مستثنٰے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں ان کلمات سے ابتدا متعین ہوتی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ ۔ (بقر)

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا ۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا (براۃ)

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ (فرقان)

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ (انعام)

کَلَّا ۔ یہ کلمہ کلام مجید میں تینتیس مقام پر استعمال ہوا ہے۔ منجملہ ان کے سات مقام پر بالاتفاق رَدْعٌ یعنے طلب خبر و آزمائش کے معنے میں آیا ہے۔ اس واسطے وہاں پر وقف کیا جائے گا۔ اور وہ مقامات یہ ہیں:۔

عَبْدًا کَلَّا ۔ عِزًّا کَلَّا ۔ (مریم) ۔ ان یَقْتُلُوْنَ قَالَ کَلَّا ۔ اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ قَالَ کَلَّا (شعراء) شفعاء کَلَّا ۔ ان ازید کَلَّا ۔ این المفر کَلَّا ان کے علاوہ دُوسرے مقامات پر وقف اچھا نہیں۔ اور ان میں بعض مقامات ہیں۔ جہاں دونوں امروں کا احتمال ہے۔ وہاں وقف کرنا اور نہ کرنا دونو وجہیں جائز ہیں؛

اِمالہ اور فتح

جمالُ القرائیں صفوان بن عسّال سے مروی ہے۔ کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یایحیٰی امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسی نے عرض کی یا رسول اللہ آپ امالہ فرماتے ہیں۔ اور یہ قریش کی بول چال میں ہے۔ ارشاد ہوا۔ یہ اقوال بنی سعد کی زبان ہے۔ امالہ یہ ہے۔ کہ فتح کو کسرہ کی جانب اور الف کو بجانب یٰ زیادہ مائل کرکے ادا کریں۔ یہ امالہ محض ہے اس کو اَضْجاع ۔ البطح اور الکسر بھی کہتے ہیں؛

(۲) الف کی قرأت بین اللفظین کیجائے۔ یعنے الف و یٰ دونو کے بیچ میں کچھ ادھر جھکتی ہوئی اور کچھ ادھر۔ اسے تقلیل تلطیف۔ بین بین کہتے ہیں؛

امالہ بین بین کے دو قسم ہیں۔ شدیدہ و متوسّط کلام مجید میں امالہ اوسط پسندیدہ ہے۔ اور امالہ کی غرض اس بات سے مُطّلع کرنا ہے۔ کہ یٰ ۔ الف کی اصل ہے۔ اور اس بات پر آگاہ کرنا ہے۔ کہ کسی جگہ الف ۔ یٰ کے ساتھ بدل بھی جاتا ہے۔ یا تلفظ میں اپنے قریب کی حرکت کسرہ اور یٰ کا ہمشکل بنجاتا ہے؛

فَتْح ۔ وہ ہے۔ کہ قاری حرف کو تلفظ کرتے وقت اپنا منہ کھول دے۔ اسے تفخیم بھی کہتے ہیں۔ یہ دو قسم ہے۔ شَدِیْدَہ و مُتَوَسِّطَہ ۔ پسندیدہ فتح متوسط ہے؛

ادغام ۔ اظہار ۔ اِخفا ۔ اقلاب ۔

ادغام دو حرفوں کو تشدید دے کر ایک حرف کی طرح تلفظ کرنے کا نام ہے۔ اسکی دو قسم ہیں۔ کبیر و صغیر ۔ ادغام کبیر یہ ہے۔ کہ اس کے دو حرفوں میں کا پہلا حرف متحرک ہو۔ عام اس سے کہ وہ دونو حرف باہم مثل ہوں یا ہمجنس ۔ یا ایک دُوسرے

کے قریب المخرج۔ اس کی نسبت ابو عمر بن العلا کی طرف کی جاتی ہے۔

متماثلین سے وہ حروف مراد ہیں۔ جو مخرج و صفت میں باہم متفق ہوں۔ جیسے ب۔ ت۔ ث۔ ح۔ د۔ س۔ ع۔ غ وغیرہ اور متجانسین وہ حروف ہیں۔ جو متفق المخارج ہوں۔ اور صفت میں ایک دوسرے سے جداگانہ ہوں۔

متقاربین وہ حروف ہیں۔ جو مخرج اور صفت دونوں میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہوں۔

ادغام صغیر یہ ہے۔ کہ اس میں پہلا حرف ساکن ہوتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں واجب۔ ممتنع۔ جائز۔ اظہار کی نسبت عام قاریوں کا یہ قول ہے۔ کہ وہ حروف حلق کے قریب آجانے کی حالت میں ہوتا ہے۔ جیسے وَاَنْهَارٌ وَانْحَرْ۔ اور اخفا باقی ماندہ حروف ہجی کے نزدیک آنے کی حالت میں جیسے مِنْ بَابٍ۔ اَنْشَرَهٗ۔ اور خفا اس حالت کو کہتے ہیں۔ جو ادغام و اخفا کے مابین ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ غنّہ کا ہونا لازمی ہے۔

مدّ اور قصر

مد اس زیادتی (کشش صوت) کا نام ہے۔ جو حرف مد میں طبعی کشش صوت کے علاوہ مطلوب ہوتی ہے۔ اور طبعی کشش صوت یہ ہے جس سے کم پر مدّ ذاتی طور پر سے بھی قائم نہیں ہو سکتا۔

اور قصر اس زیادتی کو چھوڑ کر مدّ طبعی کو علٰے حالہٖ قائم رکھنے کا نام ہے۔ مدّ پیدا پیدا ہونے کا سبب کبھی لفظی ہوتا ہے اور کبھی معنوی۔

سبب لفظی ہمزہ یا سکون کا آنا ہے۔ ہمزہ کی وجہ سے مدّ آنے کا سبب یہ ہے۔ کہ حرف مد خفی ہوتا ہے اور ہمزہ دشوار۔ اس حرف خفی میں زیادتی کر دی جاتی ہے۔ کہ اس کی وجہ سے دشوار حرف کو زبان سے ادا کرنے میں آسانی ہو سکے۔ اور اس کے نطق پر بسہولت قدرت حاصل ہو جائے۔

ہمزہ حرف مد کے قبل اور بعد دونوں حالتوں میں آتا ہے۔ جیسے آدم۔ رَاٰی۔

ایمان۔ اور بعد میں آنے والا ہمزہ اگر حرف مدّ کے ساتھ ایک ہی کلمہ میں ہے۔ تو وہ متصل ہوگا۔ مثلاً اُولٰٓئِكَ وَمِنْ سُوْٓءٍ اور اگر حرف مد ایک کلمہ کے اخیر میں ہے۔ اور ہمزہ دوسرے کلمہ کے شروع میں۔ تو پھر وہ منفصل ہوگا۔ جیسے بِمَآ اُنْزِلَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ۔

سکون۔ کے باعث مدّ پیدا کرنے کی یہ وجہ ہوتی ہے۔ کہ اس کے ذریعہ سے دو ساکن حروف کو باہم جمع کر سکتے ہیں۔ گویا مدّ کو قائمقام حرکت بنا دیا جاتا ہے۔ اور سکون یا لازمی ہوتا ہے۔ یعنے وہ جو اپنی دونو حالتوں (اوّل کلمہ یا وسط کلمہ) میں متغیر نہیں ہوتا۔ جیسے وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ دَآبَّةً اور یا عارضی ہوتا ہے۔ یعنے وقف وغیرہ کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ جیسے الحساب۔ اَلْعِبَاد۔ الرَّحِيْم بحالت وقف۔

مدّ کا سبب معنوی

اس کا سبب معنوی نفی میں مبالغہ کرنے کا قصد ہے۔ مدّ تعظیم بھی اس قسم کی ایک مد ہے۔ جیسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

قاعدہ۔ جس وقت مدّ کا سبب متغیر ہو جائے۔ اس وقت دو باتیں جائز ہوتی ہیں۔ اصل کے لحاظ سے مدّ دینا اور لفظ کے لحاظ سے قصر کرنا۔

ابو بکر نیشاپوری لکھتے ہیں۔ قرآن کی مدّات دس وجوہ پر ہوتی ہیں۔

(۱) مدّ الحجز یہ مدّ جائز ہے۔ جیسے ءَاَنْذَرْتَهُمْ ءَاَنْتَ قُلْتَ۔ کیونکہ یہاں پر دو ہمزوں کے مابین ایک روکاوٹ داخل کر دی گئی ہے۔ اور حاجز (روکاوٹ) کی مقدار بالاجماع ایک پورے الف کے برابر ہے۔

(۲) مدّ العدل ہر ایک ایسے مشدّد حرف میں ہوتا ہے۔ جس کے قبل کوئی مدّ اور لین کا حرف ہو۔ مثلاً اَلضَّآلِّيْنَ۔ کیونکہ یہ مدّ ایک حرکت کا معادل ہے۔ یعنے روک لینے میں حرکت کا قائمقام ہوتا ہے۔

(۳) مدّ تمکین مثلاً اُولٰٓئِكَ الْمَلٰٓئِكَةَ اور تمام ایسی مدّات جن کے بعد ہمزہ آتا ہے۔ کیونکہ یہاں پر مد محض اس واسطے لایا گیا ہے۔ کہ اس کے ذریعہ سے ہمزہ

کی تحقیق ہو سکے۔ اور اس کو اپنے مخرج سے ادا کئے جانے میں آسانی حاصل ہو؛

(۴) مد بسیط و مد الفصل جیسے بِمَآ اُنْزِلَ یہ مد دو متصل کلموں میں پھیلتا ہے؛

(۵) مد روم جیسے هَآ اَنْتُم یہاں اَنْتُمْ کے ہمزہ کا روم کرتے ہیں۔ اور مخفی یا بالکل ترک نہیں کرتے بلکہ اُسے ملین کرتے ہیں۔ اور اس کی جانب اشارہ کر دیتے ہیں۔ اس مد کی مقدار ڈیڑھ الف کے برابر ہے؛

(۶) مدّ الفرق۔ جیسے آلْآنَ اس مد کے ذریعہ سے استفہام اور خبر کے مابین فرق کیا جاتا ہے اس مد کی مقدار بالاجماع پُورے ایک الف کے برابر ہے۔ پھر اگر الف و مد کے درمیان کوئی مشدّد حرف ہے۔ تو ایک اور الف زیادہ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے ہمزہ کی تحقیق ہو سکے

(۷) مدّ المُبَالغہ۔ یا تعظیم۔ جیسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

(۸) مدّ البَدَل من الھمزہ۔ جیسے آدم۔ آخر۔ آمن۔ اس کی مقدار ایک الف کے برابر ہے

(۹) افعال ممدُودہ۔ میں آنے والا مدّ۔ جیسے جآء۔ شآء۔

(۱۰) مدّ البیّنہ۔ یعنے اسمائے مقصورہ و ممدودہ میں آنے والا مد ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مدّ البیّنہ اسمائے مقصورہ و ممدودہ کے مابین فرق امتیازی کی غرض سے لائی جاتی ہے۔ اور افعال ممدودہ کی مد اصل فعلوں میں خاص معانی کے لئے آتی ہے؛

خَبَر وَ اِنشاء

انشاء وہ کلام ہے۔ جس کا مدلول کلام کے ساتھ خارج میں حاصل ہوتا ہو۔ اور خبر وہ کلام ہے۔ جو اس کے خلاف ہو۔ اور کہا ہے۔ کلام اگر اپنی وضع کے ذریعہ سے کسی طلب کا فائدہ دیتا ہے۔ تو وہ اس بات سے خالی نہ ہوگا۔ کہ ماہیّت کے ذکر یا اس کی تحصیل اور یا اس سے باز رہنے کی طلب کرے۔ ان میں سے پہلی قسم کا کلام استفہام اور دُوسرا امر۔ تیسرا نہی ہے۔ اور اگر بالوضع طلب کا فائدہ نہ دیتا ہو۔ تو اس حالت میں اس کے محتمل صدق و کذب نہ ہونے کی صورت میں اسے تنبیہ اور انشاء کے ناموں سے موسوم کرینگے اور اگر وہ کلام صدق و کذب کا احتمال من حیث ہو۔ (یعنے اپنے کلام ہونے کی حیثیت سے) کرتا ہو۔ تو وہ خبر ہے؛

خبر کا مقصود یہ ہے۔ کہ مخاطب کو بات کا فائدہ پہونچایا جاوے۔ یعنے اس کو کس امر کا علم دلایا جائے۔ بعض اوقات خبر بمعنے امر وارد ہوتی ہے۔ مثلاً وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ اور بمعنے نہی بھی وارد ہوتی ہے۔ جیسے لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ بمعنے دعا۔ جیسے اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ اسی قسم سے ہے۔ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ کہ یہ ابی لہب کے حق میں دعائے بد ہے۔ لیکن ابن عربی کہتے ہیں۔ اس قسم کے اخبار کی نفی و اثبات کا رجوع شرعی وجوہ کی طرف ہوتا ہے۔ نہ وجوہ محسوس کی طرف۔ پس وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ کے معنے یہ ہیں۔ کہ وہ مشروع ہونے کے لحاظ سے ایسا کریں۔ نہ محسوس ہونے کے اعتبار سے اس لئے کہ ہم کو بعض مطلّقہ عورتیں ایسی بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جو تربّص (انتظاری عدّت) نہیں کرتیں۔ لہذا نفی کا عود خواہ مخواہ شرعی حکم کی طرف ہوگا۔ نہ بجانب وجود حسّی۔ اسیطرح لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ سے یہ مراد ہے۔ کہ از روئے شرع کوئی ناپاک آدمی مصحف کو نہ چھوئے۔ اور اگر اسے کوئی عدم طہارت کی حالت میں مس کریگا۔ تو وہ حکم شرعی کی خلاف ورزی کریگا۔

تعجُّب۔ یہ خبر کی ایک قسم ہے۔ اس سے ابہام مطلوب ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق ہر ایک ایسی چیز پر ہوتا ہے۔ جس کا سبب مبہم ہو۔ اصل یہ معنی کی صفت ہے۔ اور لفظ تعجّب صرف اس معنے سے کہ وہ ایسے معنے پر دلالت کرتا ہے۔ مجازاً تعجب کہلاتا ہے۔ مَآ اَفْعَلَ اور اَفْعِلْ بِهٖ تعجب کے صیغے ہیں۔ ان کے سوائے بعض اور لفظ بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے کَبُرَ۔ قولہ تعالےٰ۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اور كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اور كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ۔ تعجّب کا ورود جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہو۔ تو وہ مخاطب کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ قولہ۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔ یعنے ان لوگوں پر تعجب کرنا واجب ہے۔ اور خدا تعالےٰ کی توصیف تعجّب کے ساتھ اس واسطے نہیں کیجاتی۔ کہ گویہ اِسْتِعْظَام (عظمت دینا) ہے۔ تاہم اس کے ساتھ جہل کی شرکت رہتی ہے۔ اور پروردگار اس بات سے منزّہ ہے۔ اور ایک جماعت اس قسم کے تعجّب کو تعجیب سے تعبیر کرتی ہے۔ یعنے یہ کہ ایسے مقاموں پر خداوند کریم اپنی طرف سے مخاطب کو تعجّب میں ڈالتا

ہے۔ دعا و ترجّی یہ بھی اسی قسم سے ہے۔ سیبویہ نے وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ کے بارے میں کہا ہے۔ کہ تم اس کو بددعا نہ کہو۔ کہ ایسا کہنا بہت برا ہے۔ مگر چونکہ اہل عرب اپنی زبان میں ایسا ہی بولتے ہیں۔ اور نزول قرآن الٰہی کی لغت پر ہوا ہے۔ اس لئے گویا وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ اس معنے میں کہا گیا۔ کہ یہ لوگ ان میں سے ہیں۔ جن کی نسبت ایسا کہنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ کلام محض شریروں اور ہلاکت میں پڑنے والوں کے لئے کہا جاتا ہے۔ اور اس بنا پر کہا گیا۔ کہ یہ لوگ ان میں سے ہیں۔ جو کہ ہلاکت میں داخل ہوئے۔

وَعْدَ وَوَعِیْد یہ بھی خبر کی ایک قسم ہے۔ مثلاً سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ۔ اور کہا ہے۔ کہ انشاء کی قسم سے ہے۔

نفی و جحد - ان دونوں میں فرق یہ ہے۔ کہ جحد کا کہنے والا اگر صادق ہے۔ تو اس کی کلام کو نفی کہتے ہیں۔ اور اگر وہ کاذب ہے۔ تو اس کو جحد و نفی دونو ناموں سے موسوم کریں گے۔ نفی کی مثال - مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ۔ اور جحد کی مثال - فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ؕ۔

ادوات نفی - لَا - لَاتَ - لَیْسَ - مَا - اِنْ - لَمْ - لَمَّا ہیں۔ واضح ہو۔ کہ حروف نفی میں اصل لَا اور مَا ہیں۔ کیونکہ نفی یا زمانہ گزشتہ میں ہوگی۔ اور یا زمانہ آیندہ میں۔ اور استقبال ماضی کی نسبت ہمیشہ زائد ہوتا ہے اور حرف لَا بہ نسبت مَا کے خفیف ہے۔ لہٰذا اخف بمقابلہ اکثر وضع کیا گیا۔ اور ماضی میں چونکہ نفی کی حالت مختلف ہوتی ہے۔ یعنے یا تو ایک ہی استمراری نفی ہوا کرتی ہے۔ یا ایسی ہوتی ہے۔ جس میں متعدد احکام ہوں۔ اور یہی حالت نفی کی مستقبل میں بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا نفی کی چار قسمیں ہوئیں۔ ان کے لئے مَا - لَمْ - لَنْ - لَا - چار کلمات لئے گئے۔ اور باقی دو کلمے اِنْ اور لَمَّا کوئی اصل نہیں ہیں پس مَا اور لَا ماضی اور مستقبل دونو زمانوں میں باہم مقابل ہیں۔ اور لَمْ ایسا ہے۔ کہ

گویا وہ لَا اور مَا سے ماخوذ ہے۔ اس واسطے کہ لَمْ لفظاً استقبال میں نفی کے واسطے آتا ہے۔ اور معناً زمانہ ماضی میں نفی کے لئے ہے۔ چنانچہ لَا جو کہ مستقبل کی نفی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں سے حرف لام اور مَا جو کہ ماضی کی نفی کے لئے آتا ہے اس میں سے حرف میم لے کر ان دونو کو اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے جمع کر دیا کہ لَمْ میں مستقبل اور ماضی دونو زمانوں کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اور لام کو میم پر مقدم کرنے میں یہ اشارہ ہے۔ کہ نفی کی اصل حرف لَا ہے۔ اس وجہ سے اثنائے کلام میں جو نفی کیجاتی ہے۔ وہ اس حرف لَا کے ساتھ آتی ہے۔ مثلاً لَمْ یَفْعَلْ زَیْدٌ وَلَا عَمْرٌو اور باقی رہا حرف لَمَّا - اس میں ترکیب در ترکیب ہے۔ گویا کہنے والے نے کہا - لَمْ اور مَا تاکہ اس سے ماضی میں معنی نفی کی تاکید پر دلالت کرے۔ اور استقبال کا فائدہ بھی دے اور اسی وجہ سے لَمَّا استمرار کا فائدہ دیتا ہے۔

اغراض و فوائد نفی

(۱) ایک شے کسی چیز کا نفی کیا جانا کبھی اس لئے ہوتا ہے۔ کہ وہ یعنی منفی اس منفی عنہ شے میں از روئے عقل شمار نہیں ہو سکتی مثلاً وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا ؕ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

(۲) کبھی یہ انتفا اس لئے ہوتا ہے۔ کہ وہ شے منفی باوجود امکان وقوع کے شے منفی عنہ سے واقعہ نہیں ہوئی مثل - لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا - ذات موصوفہ کی نفی سے کبھی ذات کے علاوہ محض صفت کی نفی مراد ہوا کرتی ہے۔ جیسے وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ ط یعنے بلکہ وہ جسد ہیں۔ اور طعام کھاتے ہیں۔ کبھی اس سے ذات اور صفت دونو کی نفی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا - یعنی بالکل سوال ہی نہیں کرتے - اس لئے ان الحاف (گڑگڑانا) وقوع ہی میں نہیں آتا۔ وقولہٗ تعالےٰ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ - یعنے ان کے لئے کوئی شفیع ہی نہیں۔ وقولہٗ - فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ ط یعنے ان کے لئے کوئی ایسی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ جس کی شفاعت انکو فائدہ دے

اس قسم کی نفی کو علم بدیع میں نفی شئے بایجابہ کہتے ہیں ؛

(۳) کبھی بغرض مبالغہ و تاکید شے کی مطلقاً نفی کی جاتی ہے - قولہ تعالےٰ - وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ - کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود کسی برہان کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا ؛

(۴) کبھی ایک شئے کی نفی اس وجہ سے کی جاتی ہے - کہ وہ وصف میں ناقص اور بے ثمرہ ہے - مثلاً اہل دوزخ کی حالت بیان کرتے ہوئے قولہ تعالےٰ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى - اس جگہ دوزخیوں سے موت کی نفی اسوجہ سے کردیگئی ہے - کہ وہ صریح موت نہیں - ایسے ہی حیات کی نفی سے یہ مراد ہے - کہ وہ کوئی اچھی اور مفید زندگی نہیں ؛

(۵) استطاعت کی نفی سے کسی حالت میں قدرت اور امکان کی نفی مراد ہوتی ہے مثلاً هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ - کیا اللہ تعالےٰ ایسا کریگا - اور بقراۃ تَ یہ معنے ہوں گے - کہ کیا تم ہماری بات منظور کرکے خدا تعالےٰ سے نزول مائدہ کی درخواست کروگے - کیونکہ ان لوگوں کو بخوبی یہ بات معلوم تھی - کہ اللہ تعالےٰ مائدہ نازل کرنے پر قادر ہے ساعد حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو سوال کی قدرت حاصل ہے ؛

اور کسی جگہ کلفت و مشقت میں مبتلا ہونے کا اظہار مقصود ہوتا ہے - مثلاً اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا - کہ اگر تم میرے ساتھ رہوگے - تو سخت دقت میں مبتلا ہوگے ؛

قاعدہ - عام کی نفی خاص کی نفی کو اور خاص کا ثبوت عام کے ثبوت کو مستلزم ہے - مثلاً قولہٗ فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ؕ

اَضَاءَتْ کے بعد بضوءھم اس لئے نہیں لایا گیا - کہ نور بہ نسبت ضوء کے عام ہے کہ نور کم وزیادہ ہر طرح کی روشنی پر بولا جاتا ہے اور ضوء خاصکر نور کثیر ہی پر استعمال ہوتا ہے جیسے هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا - چونکہ نور ضوء سے عام ہے - لہذا نور کے نہ ہونے سے ضوء کی نفی ضروری ہے - اور غرض بھی یہی ہے - کہ ان لوگوں سے ہر قسم کی روشنی کا ازالہ ظاہر کیا جائے جس کی تاکید میں کہا گیا - وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ؕ

اور ثبوت کے استلزام کی یہ مثال ہے - وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ -

یہاں طُوْلُهَا نہیں کہا گیا - اس لئے کہ عرض بہ نسبت طول کے خاص ہے - کہ جو شے عریض ہوگی - ضرور طویل بھی ہوگی - مگر اس کا عکس ضروری نہیں ؛

فائدہ - فعل میں مبالغہ کی نفی کرنا - اصل فعل کی نفی کا مستلزم نہیں ہوتا - اور آیت وَمَا كَانَ رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ کا جواب یہ ہے - کہ یہاں مبالغہ بغرض تعریض ہے - اور بتانا یہ ہے - کہ دنیا میں ظالم حکام بندوں پر سخت عذاب کرتے ہیں ؛

فائدہ - جس مقام پر دو کلاموں کے درمیان دو جحد واقع ہوں - وہ کلام خبر ہوتا ہے - قولہٗ - وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ - بمعنے اِنَّمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا يَّاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ - ہم نے ان کو کھانا کھانے والا جسم بنایا ؛

اور جہاں کہیں جحد آغاز کلام میں لاتے ہیں - وہاں حقیقی جحد ہوتا ہے - قولہٗ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ - اور جبکہ آغاز کلام میں دو جحد واقع ہوں - تو ان میں سے ایک جحد زاید ہوتا ہے - مثلاً مَا اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ ؕ

انشا کے اقسام

(۱) استفہام - استفہام طلب فہم کو کہتے ہیں - اور کہا ہے - استفہام اس بات کا نام ہے - کہ خارجی شئے کی صورت کا ذہن میں مرتسم کیا جانا طلب کیا جائے - اس واسطے اس کا صدور جب تک کسی اس طرح کے شک کرنے والے شخص سے نہ ہو - جو کہ اعلام (علم دلانے) کا مصداق ہے - اس وقت تک استفہام کے لئے یہ بات لازمی ہے - کہ وہ حقیقت نہ ہو - کیونکہ شک نہ کرنیوالا شخص جس وقت استفہام کریگا - تو اس کا یہ فعل تحصیل حاصل ہوگا - اور اطلاع دہی کے امکان کی تصدیق نہ کرے - تو استفہام کا فائدہ جاتا رہتا ہے - اور کہا گیا ہے - قرآن مجید میں جو باتیں استفہام کے طور پر آئی ہیں - وہ اللہ تعالےٰ کے خطاب میں بایں معنے واقعہ ہوئی ہیں - کہ مخاطب کے نزدیک اس اثبات یا نفی کا علم ہو ؛

ادوات استفہام - ھمزہ - ھَلْ - مَا - مَنْ - اَيٌّ - لِمَ - كَيْفَ - اَيْنَ - اَنّٰى - مَتٰى - اَيَّانَ ؛

استفہام کے معانی - انکار اور اس کے اندر نفی کے اعتبار پر استفہام کے معنی پائے

جاتے ہیں۔ اور اس کا مابعد منفی ہوا کرتا ہے۔ اسی واسطے اس کے ساتھ الاّ حرف استثنا ضرور آتا ہے۔ قولہ۔ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ؕ وَهَلْ نُجٰزِیْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ۔ اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ۔ ای لا نؤمن لک۔ اور اکثر حالتوں میں تکذیب بھی پائی جاتی ہے۔ مثل قولہ۔ اِذا اصفاكم رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ۔ یعنے لم يفعل ذٰلِكَ۔ وقولہ۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ۔ ای لا يكون ذٰلك الالزام ؕ

(۲) بمعنے توبیخ۔ اس کو انکار ابطال بھی کہتے ہیں۔ اس انکار توبیخی کا وقوع اکثر ایسے ثابت امر میں ہوتا ہے۔ جس کے کرنے پر سرزنش کی گئی ہو۔ مثل اَفَعَصَيْتَ اَمْرِی۔ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ۔ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ؕ

اور بعض اوقات اس کا وقوع کسی ایسے فعل کے ترک پر ہوتا ہے۔ جس کا وقوع مناسب تھا۔ مثل قولہ۔ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ۔ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔

(۳) تقریر یعنے مخاطب کو کسی ایسے اقرار اور اعتراف پر آمادہ کرنا جو اس کے نزدیک قرار پذیر ہو چکا ہو۔ اس استفہام میں حرف هَلْ کا استعمال کبھی نہیں ہوتا۔ اور اکثر ہمزہ لایا جاتا ہے۔ جیسے اوپر کی مثالوں میں ذکر ہوا ہے ؕ

اور کہا ہے۔ هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ میں هل بمعنے تقریر ہے ؕ

اس استفہام کے ساتھ کلام موجب ہوا کرتا ہے۔ اس واسطے اس پر صریحی موجب کلام کا عطف ہوتا ہے۔ مثل قولہ۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ۔ کیونکہ استفہام تقریر کی حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ انکار کا استفہام ہوتا ہے۔ اور انکار نفی ہے۔ اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے۔ مثل قولہ۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔

(۴) تعجب یا تعجیب۔ قولہ۔ كَيْفَ تَاْمُرُوْنَ بِاللّٰهِ۔ مالِیَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ۔

(۵) عتاب۔ (غصہ ظاہر کرنا)۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ؕ

(۶) تذکیر (یاد دہانی) اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ ؕ

(۷) افتخار۔ الیس لی ملک مصر ؕ

(۸) تفخیم۔ مالِهٰذا الكتاب لا يُغادِرُ صغيرةً ولا كبيرةً اِلَّآ اَحْصٰهَا۔

(۹) تہویل وتخویف۔ الحاقة۔ ما الحاقة۔ القارعة ما القارعة۔

(۱۰) تسہیل وتخفیف۔ ماذا عليهم لو اٰمنوا ؕ

(۱۱) تہدید ووعید۔ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ؕ

(۱۲) تکثیر۔ وكم من قريةٍ اَهْلَكْنٰهَا۔

(۱۳) تسویہ۔ یہ استفہام ایسی جمع پر داخل ہوتا ہے۔ جس کے محل میں مصدر کا حلول صحیح ہو۔ مثلاً قولہ تعالےٰ۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ ای انذارك وعدمه سواءٌ۔

(۱۴) امر۔ ءَاَسْلَمْتُمْ۔ ای اَسْلِمُوْا۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ ای انتهوا۔

(۱۵) تنبیہہ۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ ای انظر۔

(۱۶) ترغیب۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ۔

(۱۷) دعا۔ ادنےٰ سے اعلیٰ کی طرف۔ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ۔ ای لا تهلكنا۔

(۱۸) استرشاد۔ (طلب رہنمائی کرنا)۔ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا۔

(۱۹) تمنی۔ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ۔

(۲۰) اِستبطا۔ متىٰ نصر الله۔

(۲۱) عرض۔ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ۔

(۲۲) تحضیض۔ اَلَا تقاتلون قوماً نكثوا ايمانهم۔

(۲۳) تجاہل۔ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذكر من بيننا۔

(۲۴) تعظیم۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔

(۲۵) تحقیر۔ اهٰذا الذی بعث الله رسولا۔

(۲۶) اکتفا۔ اليس فی جهنم مثوًى للمتكبرين۔

(۲۷) استبعاد۔ انّٰى لهم الذكرىٰ۔

(۲۸) ایناس (انس ولانا) ماتلك بيمينك يموسٰے ؛

(۲۹) تحکم و استہزا - اَصَلاتُكَ تَاْمرُكَ - مالكم لا تنطقون ؕ

(۳۰) اخبار ہی - افی قلوبهم مرضٌ - ام ارتابوا - هل اتی علی الانسان حین ؕ

قاعدہ - جس امر کا انکار کیا گیا ہے - اس کا ہمزہ استفہام کے بعد ہی آنا اور اس سے متصل ہونا ضروری ہے - اور افاصفاکم ربکم بالبنین میں ہمزہ اَصفا پر داخل ہوا ہے حالانکہ وہ منکر نہیں - بلکہ یہاں مقولہ کفار - اِنَّ اللّٰہَ اتخذ من الملئکۃ اناثا کا انکار کیا گیا ہے - اس کی وجہ یہ ہے - کہ اس جگہ دونو جملوں کے مجموعہ پر منکر ہونا مراد ہے - اور ان دونو سے ملکر ایک کلام بنتا ہے - تقدیر عبارت یہ ہے - وجمع بین الاصفاء بالبنین واتخاذ البنات -

امر - یہ انشا کی ایک قسم ہے - بمعنے طلب فعل - صیغہ اس کا اِفْعَلْ لِیَفْعَلْ ہے - امر ایجاب کی حالت میں حقیقت ہوا کرتا ہے - جیسے واقیموا الصّلوٰۃ فلیصلوا معك اور مجازاً چند معنوں میں آتا ہے (۱) ندب (برانگیختہ کرنا) اذا قرئ القرآن فانصتوا - (۲) اباحت - فكاتبوهم - اذا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا - (۳) کم درجہ والے کی طرف سے دُعا - رَبِّ اغْفِرْلِیْ - (۴) تہدید - اِعْمَلُوْا ماشِئتم - اس واسطے کہ یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں ہر ایک کام کی جس کو وہ چاہیں - کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے - (۵) اہانت - ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ - (۶) تسخیر یعنے ذلیل بنانے کے لئے - کُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ - (۷) تعجیز - فاتوا بسُوْرَةٍ من مثله - کہ غرض اس سے ریتیاں آیت نہیں ہے - بلکہ ان کی عاجزی کا اظہار مطلوب ہے - (۸) امتنان (احسان پذیری) کُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖ اذا اَثْمَرَ - (۹) تعجب - اُنْظُرْ کیف ضربوا لك الامثال - (۱۰) تسویہ - فَاصْبِرُوْا ولا تصبروا (۱۱) ارشاد - واشهدوا اذا تبایعتم - (۱۲) احتقار القوا ما انتم ملقون - (۱۳) انذار - تَمَتَّعُوْا - (۱۴) اکرام - ادخلوها بسلام اٰمنین - (۱۵) تکوین - کُنْ فَیَکُوْنُ - اس میں بہ نسبت تسخیر کے زیادتی ہے (۱۶) انعام - (نعمت کی یاد دہانی) کُلُوْا مِمَّا رزقکم اللّٰہ - (۱۷) تکذیب - قل فاتوا

بالتوراۃ فاتلوها ان کنتم صٰدقین - (۱۸) مشورت - فانظر ماذا تری - (۱۹) اعتبار - فانظروا الی ثمرہ - (۲۰) تعجب - اسمع بهم وَاَبْصِرْ -

نہی - یہ بھی انشا کی قسم ہے

نہی کسی فعل سے باز رہنے کی طلب کو کہتے ہیں - صیغہ اس کا لَا تَفْعَلْ ہے - نہی تحریم کے معنے میں حقیقت ہے - اور مجازاً چند معنوں میں استعمال ہوتی ہے ؛

(۱) کراہت - لا تمش فی الارض مرحاً - (۲) دُعا - ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هدیتنا (۳) ارشاد - لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اشیاء ان تبد لکم تسؤکم - (۴) تسویہ - اصبروا ولا تصبروا - (۵) احتقار و قلیل - ولا تمدن عینیك - یعنے وہ چیز حقیر اور قلیل ہے - (۶) عاقبت - ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتاً بل احیاءٌ - یعنے جہاد کا انجام کار حیات ہے - نہ کہ موت - (۷) یاس - لا تعتذروا (۸) اہانت - اخسئوا فیها ولا تکلمون -

تمنی

تمنی یہ ہے - کہ بسبیل محبت کسی شے کے حصول کی آرزو کی جائے - یعنے طلب کیجائے - اور تمنے کے لئے جانے والے امر کا امکان مشروط نہیں - بخلاف مترجّی کے - کہ اس کا امکان مشروط ہے - اس کا موضوع لہٗ حرف لیت ہے - یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ - یٰلَیْتَ قومی یعلمون ؕ

اور هَلْ کے ساتھ جیسے هَلْ لَّنَا من شفعاءَ فیشفعوا لنا - یہ ایسے مقام پر ہوتا ہے - جہاں کہیں آرزو کئے جانے والے امر کا فقدان معلوم ہوتا ہے ؛

اور لو کے ساتھ مثل قولہ فَلَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّةً فَنَکُوْنَ - یہاں تمنا ہی کی وجہ سے جواب میں فعل کو نصب دیا گیا ہے ؛

اور امور بعیدہ کے بارے میں لَعَلَّ کے ساتھ آتا ہے - لَعَلِّیْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ - جواب کے نصب دینے میں اس کو لَیْتَ کا حکم دیا گیا -

ترجّی - انشا کی ایک قسم ہے - اس میں آرزو کئے جانے والے امر کا امکان مشروط ہوتا

ہے۔ پس تمنّی اور ترجّی میں فرق یہ ہے۔ کہ تمنی ممکن وغیر ممکن دونو امور کے واسطے استعمال کی جاتی ہے۔ اور ترجّی فقط ممکن امر میں۔ اور تمنی کا استعمال بعید میں اور ترجّی کا قریب میں ہوتا ہے۔ ایسے ہی تمنّی غیر متوقع امور میں اور ترجّی متوقع امر میں استعمال ہوتی ہے؛

حرف ترجّی۔ لَعَلّ اور عسیٰ ہے۔ کبھی اس کا ورود مجازاً بھی ہوتا ہے۔ یہ ایسی حالت میں ہوتا ہے۔ جبکہ کسی محذور کی توقع پائی جاتی ہے۔ اس کا نام اشفاق (ڈرولانا) ہے مثل قولہٗ لَعَلَّ السَّاعۃ قریب؛

نِدا۔ (انشا کی قسم ہے)

کسی ایسے حرف سے جو قائمقام اَدْعُوْا کا ہے۔ کسی شخص کو داعی کی طرف متوجہ کرنے کا نام ندا ہے۔ بُلانے والے کو داعیؔ اور بُلائے گئے کو مدعو کہتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں ندا کا فعل امرونہی کے ساتھ رہتا ہے۔ اور بیشتر وہ مقدم ہی ہوا کرتا ہے۔ یٰایّھا النّاس ضُرِبَ مثلٌ فاستمعوالہ۔ یٰقوم ھذہٖ ناقۃ اللہ لکم اٰیۃً فذروھا اور جملہ امریہ اس کے عقب میں نہیں آتا۔ جیسے یٰعبادی لاخوفٌ علیکم الیوم۔ ایھا الناس انتم الفقرآءُ الی اللہ۔ یٰابتِ ھذا تاویل رُؤیایَ۔ کبھی ندا کے ساتھ جملہ استفہامیہ بھی آتا ہے یٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَالَایَسْمَعُ وَلَایُبْصِرُ۔

اور کبھی ندا کی صورت مجازاً غیر ندا کے لئے بھی وارد ہوتی ہے۔ جیسے تحذیر میں۔ ناقۃ اللہ وسقیٰھا۔ اختصاص کے لئے جیسے رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ علیکم یٰاَھْلَ البَیْتِ؛ تنبیہہ کے لئے اِلَّا یَسْجُدُوا۔ تعجّب کے لئے یٰحَسْرَۃً عَلَے الْعِبَادِ۔ تحسّر کے لئے یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا؛

فائدہ۔ اصل میں ندا حقیقۃً حکماً بعید کے واسطے ہے۔ مگر کبھی اس کے ساتھ قریب کو بھی ندا کر لیتے ہیں۔ اور اس میں چند فوائد ہیں:۔

(۱) اظہار حِرص یٰموسیٰ اَقبل۔ (۲) جبکہ خطاب مُہتم بالشّان ہو۔ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ۔ (۳) مدعو کی شان کی بڑائی کے اظہار کے لئے۔ یٰارَبِّ۔ (۴) جبکہ مدعو کی شان کا انحطاط

مطلوب ہو۔ وَاِنّی اَظُنّکَ یٰموسیٰ مسحُوراً۔

فائدہ۔ زمخشری وغیرہ آئمہ لغت کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں بہ نسبت اور حروف کے یٰاَیُّھَا کے ساتھ ندا کی کثرت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس کلمۂ ندا میں کئی وجہیں تاکید کی اور متعدد اسباب مبالغہ کے پائے جاتے ہیں۔ یاؔ حرف ندا میں تاکید وتنبیہہ ہے۔ ھا میں بھی تنبیہہ پائی جاتی ہے۔ ایّ میں ابہام سے توضیح کی جانب تَدَرُّج (تدریجی ترقی) پایا جاتا ہے۔ اور مقام میں مبالغہ وتاکید کے لئے مناسبت ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے اوامرونواہی وعظ وپند۔ زجروتوبیخ۔ وعد۔ وعید اور گذشتہ قوموں کے حالات بیان کرنے کی قسم سے جتنی باتوں کے ساتھ اپنے بندوں کو ندا کیا ہے۔ اور اپنی کتاب کو ان کے ناطق بنایا ہے۔ وہ سب کے سب بڑے عظیم الشان امور ہیں۔ اور نہایت ہی قابل توجہ باوجود اس کے جب بندے ان امور کی طرف توجہ کرنے سے غافل پائے گئے۔ تو مقتضائے حال یہی تھا۔ کہ ان کی ندا کے لئے نہایت بلیغ اور حد درجہ کی تاکید ظاہر کرنے والا لفظ ندا میں استعمال کیا جائے؛

قسم۔ انشا کی ایک قسم ہے

اس کا فائدہ یہ ہے۔ کہ وہ جملہ خبریّہ کی تاکید اور سامع کے نزدیک اس کی تحقیق کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے قسم کھانے کے کیا معنے ہیں۔ اگر وہ مومن کے یقین دلانے کے لئے ہے۔ تو وہ محض خبر الٰہی ہی کی تصدیق کر لیتا ہے۔ اس کے لئے قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر منکرین کے لئے کھائی جاتی ہے۔ تو کچھ مفید نہیں۔ تفاسیر میں اس طرح پر جواب دیا گیا ہے۔ کہ قرآن مجید کا نزول قواعد زبان عرب کے موافق ہوا ہے۔ اور اہل عربیّت جب کسی امر کی تاکید کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو وہ اسے قسم کھا کر بیان کرتے ہیں۔ امام قشیری کہتے ہیں۔ فصلِ خصومات کے دو طریق ہیں۔ شہادت کے ساتھ یا قسم کے ساتھ۔ اللہ تعالےٰ نے دونو نوع سے اپنے کلام کو ادا فرمایا ہے۔ مثل قولہ۔ شَھِدَ اللہ انّہ لا الٰہ اِلّا ھُوَ والملٰئکۃ واولوالعلم۔ وقولہٗ قل ای ربّی انہ الحق۔ فورب السّماءِ والارض انّہ الحق وغیرہ وغیرہ؛

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سات مقام پر اپنی ذات کی قسم کھائی ہے (۱) اِیْ وَرَبِّیْ - (۲) قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ (۳) فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ (۴) فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۵) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۶) فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ ؏

اور باقی تمام قسمیں اپنی مخلوقات کے ساتھ کھائی ہیں - مثل قولہٗ - وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ط وَالصّٰٓفّٰتِ - کہا گیا ہے - اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی قسم کیونکر کھائی - حالانکہ شریعت میں غیر اللہ کے ساتھ قسم کھانے کی ممانعت آئی ہے - اور پھر قسم اس شئے کے ساتھ کھائی جاتی ہے - کہ جو معظم ہو - یعنے قسم کھانے والا اس کی تعظیم کرتا ہو - باوجودیکہ اللہ تعالیٰ سے برتر کوئی چیز نہیں - تفاسیر میں اس طرح جواب دیا گیا ہے - (۱) ان مقامات میں مضاف محذوف ہے - تقدیر عبارت یہ ہے - ورب التین ورب الزَّيْتُوْن وغیرہ - (۲) اہل عرب ایسی چیزوں کی قسم کھایا کرتے تھے - اور کلام الہٰی کے انداز محاورہ پر نازل ہوا ہے (۳) مصنوعات وجود وصانع - اس کی حکمت وقدرت کی بیّن علامات ہیں - لہٰذا تنبیہاً ان کے ساتھ قسم کا استعمال ہوا ہے ؏

قشیری کہتے ہیں قسم دو وجہوں سے کھائی جاتی ہے - شئے کی فضیلت کے سبب سے یا اس کی منفعت کے اعتبار پر - فضیلت کی مثال - وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ - لعمرك انهم لفی سکرتهم یعمهون - منفعت کی مثال - وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ - والشمس کہا ہے - قرآن مجید میں اکثر محذوفۃ الفعل قسمیں واؤ ہی کے ساتھ آئی ہیں - اور جس وقت حرف بَ قسمیہ لاتے ہیں - تو اس کے ساتھ فعل لایا جاتا ہے - قولہ واقسموا باللہ یحلفون باللہ - اور فعل کے محذوف ہونے کی حالت میں حرف بَ نہیں پایا جاتا - اسی وجہ سے باللہ اِنَّ الشرك لظلمٌ - بِمَا عَهِدَ عندك بحق کو قسم قرار دینا صحیح نہیں ؏

کلام مجید میں پندرہ سورتیں ہیں - جن کا آغاز قسم سے ہوا ہے -

والصّٰفّٰت (ملائکہ کی قسم سے) - طارق - بروج - (افلاک کی قسم سے) النجم - القمر - الشمس - الّیل - الضحٰے - العصر (ان چھ سورتوں میں توابع ولوازم فلک کی قسم وارد ہوئی ہے) والذّٰریٰت - والمرسلٰت (ہوا کی قسم سے) - والطّور (مٹی کی قسم سے)

ان تینوں سورتوں میں عناصر کی قسم وارد ہوئی ہے - والتّین (نباتات کی قسم سے) والنّٰزعٰت (حیوان ناطق کی قسم سے) والعادیات (جانوروں وچرند کی قسم سے) ؏

فائدہ - جب ایک ہی شخص کے لئے مکرر نعتیں آئیں - تو احسن یہ ہے - کہ صفات کے معنوں میں عطف کے ذریعہ سے بُعد ڈالا جائے - مثلاً ہو الاوّل والآخر والظاہر والباطن - اور اگر ان صفات میں شدت اتصال ہے یا ایک دوسرے پر وہ مترتب ہیں - تو عطف کی ضرورت نہیں - مثلاً الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم مٰلك یوم الدین ایسے ہی اگر تکرار نعت شخص واحد کے لئے نہیں - تو ترک عطف جائز ہے - قولہٗ - وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ - هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ - مَنَّاعٍ - لِّلْخَيْرِ - مُعْتَدٍ - اَثِيْمٍ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ -

بدل - اس سے ابہام کے بعد ایضاح مطلوب ہوتا ہے - اس کا فائدہ بیان اور تاکید ہے - بیان کا فائدہ تو ظاہر ہے - مثلاً جسوقت رایتُ زیداً اخاكَ کہا جاتا ہے - تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے - کہ اس زید کو دیکھا ہے - جو مخاطب کا بھائی ہے - اور تاکید کا یہ فائدہ ہے - کہ وہ بدل تکرار عامل کی نیت سے آتا ہے - اس لئے گویا بدل ومبدل منہ دو جملوں کے دو لفظ ہیں - اور اس لحاظ سے بھی کہ بدل اسی پر دلالت کرتا ہے جس پر مبدل منہ دلالت کرتا ہے - یہ دلالت بدل کل میں مطابقی - بدل بعض میں تضمنّی اور بدل اشتمال میں التزامی ہوتی ہے - مثال بدل کل - اھدنا الصراط المستقیم - صراط الذین انعمت علیھم بدل بعض کی قولہٗ للہ علی النّاس حج البیت مَنِ استطاع اِلَيْهِ سبیلاً - بدل اشتمال کی یسئلونك عن الشھر الحرام قتالٍ فیہِ قل قتالٌ فیہ کبیرٌ -

فائدہ - بدل سے صرف یہی مقصود نہیں ہوتا - کہ وہ مبدل منہ میں عارضی ہونے والے اشکال ہی کو رفع کرتا ہے - بلکہ بعض بدل ایسے ہوتے ہیں - جن سے باوجود اس بات کے کہ ان کا ماقبل تاکید سے مستغنی ہوتا ہے - پھر بھی تاکید مراد ہوا کرتی ہے - قولہٗ انك لتھدی الی صراطٍ مستقیم - صراط اللہ - کیونکہ اس میں اگر دوسرا صراط ذکر نہ کیا جاتا - تو بھی اس میں کوئی شک نہیں تھا - کہ صراط مستقیم - صراط اللہ ہی ہے ؏

بیان بعض توابع

صفت ۔ یہ ان معنوں پر دلالت کرتا ہے ۔ جو اس کے متبوع (موصوف) میں پائے جاتے ہیں ۔ اسباب صفت یہ ہیں ۔ (۱) تخصیص جبکہ اس کا موصوف نکرہ ہے ۔ فتحریرُ رقبۃٍ مومنۃٍ ۔ (۲) توضیح جبکہ موصوف معرفہ ہے ورسولُہُ النبی الامّی اس طرح کی صفات کو قید احترازی کہتے ہیں ۔ (۳) محض مدح و ثنا بدوں قصد توضیح و تخصیص مثلاً صفات اللہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ ان دونو صفتوں سے محض ثنا مقصود ہے ۔ اس لئے کہ اللہ معرفہ ہے ۔ اور اس میں تعدد کی گنجائش نہیں ۔ (۴) اظہار ذم اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ وصف رجیم محض اظہار ذم کے لئے ہے ۔ اس لئے کہ شیطان معرفہ ہے ۔ اور ایک ہی ہے ۔ (۵) رفع ابہام تاکید کے سبب مثلاً لا تتخذوا الٰھین ۔ اثنین ۔ اثنین کا لفظ بعد تثنیہ کے واقع ہے ۔ پس یہ صفت موکدہ ہے یعنے اثنینیت صیغہ الٰہین سے سمجھی جاتی تھی ۔ پھر اس کی تاکید میں اثنین لایا گیا ۔ ولا طائرٍ یطیر بجناحیہ ۔ یطیر اس بات کی تاکید کیلئے ہے کہ یہاں طائر سے حقیقۃً پرند ہی مراد ہے ۔ اس لئے کہ اس کا اطلاق مجاز کے طور پر پرند کے سوائے اور جانور پر بھی کردیا جاتا ہے ۔ اور بجناحیہ حقیقت طیران کی تاکید کے لئے ہے ۔ اس لئے کہ بعض اوقات طیران کا اطلاق مجازاً زور سے دوڑنے والے پر بھی کردیتے ہیں ۔ یقولون بالسنتھم السنۃ تاکید کے لئے ہے کہ قول کا اطلاق غیر لسانی قول پر بھی ہوا کرتا ہے ؎

قاعدہ ۔ عام صفت خاص صفت کے بعد نہیں آیا کرتی ۔ قولہ ۔ الحمد للہ ربّ العلمین الرحمٰن الرحیم وکان رسولاً نبیاً میں جو کہا گیا ہے ۔ کہ نبی صفت عام ہے ۔ اور رسول صفت خاص کے بعد واقعہ ہوئی ہے ۔ یہ صحیح نہیں ۔ بلکہ نبیاً حال واقع ہے ۔ صفت نہیں ۔ اور اس کے معنے ہیں ۔ کہ وہ اپنی نبوت کے زمانے میں رسول تھے ؎

قاعدہ ۔ صفت کا وقوع جب دو ایسے متضائف (باہم مضاف و مضاف الیہ ہونے والے) چیزوں کے بعد ہو ۔ جن میں سے پہلا عدد تو اس وقت جائز ہوگا ۔ کہ اس صفت کا اجرا مضاف اور مضاف الیہ دونوں سے ایک پر کیا جائے ۔ مضاف پر صفت کے اجرا کی مثال

یہ ہے ۔ سَبْعَ سمٰوٰتٍ طِبَاقاً اور مضاف الیہ پر اجرائے صفت کی مثال ہے ۔ سَبْعَ بقرات سمان ؎

عطف بیان بدل تاکید اور نعت میں فرق

عطف بیان ایضاح کے بارے میں نعت کے مشابہ ہوتا ہے یعنے اپنے متبوع کی تکمیل کے بارے میں صفت کا قائمقام بنتا ہے ۔ ان میں فرق یہ ہے ۔ کہ یہ اپنے متبوع کی تکمیل صرف شرح و تبیین سے کرتا ہے ۔ متبوع میں پائے جانے والے کسی معنی یا سببیّہ پر دال ہوکر نہیں کرتا ۔ اور اپنی دلالت کی تقویت میں تاکید کا قائمقام ہوتا ہے ۔ فرق یہ ہے ۔ کہ تاکید کی طرح مجاز کے توہم کو رفع نہیں کرتا ۔ اور استقلال کی صلاحیت رکھنے میں بدل کے مشابہ ہے ۔ فرق یہ ہے ۔ کہ اس کے اطراح کی نیت نہیں ہوتی ۔ مثلاً قولہ ۔ فیہ آیات بیّنات مقام ابراھیم ۔ وقولہ من شجرۃٍ مبارکۃٍ زیتونۃٍ ؎

اور کبھی محض مدح کے لئے لایا جاتا ہے ۔ قولہ ۔ جعلَ اللّٰہُ الکعبۃَ البیت الحرام کہ یہاں پر بیت الحرام مدح کے لئے عطف بیان ہوا ہے ۔ نہ ایضاح کے لئے ۔

اور کہا ہے بدل و عطف بیان میں فرق یہ ہے کہ بدل خود مقصود ہوا کرتا ہے ۔ اسطرح کہ گویا تم بدل کو مبدل منہ کے موضعہ میں مقرر کردیتے ہو ۔ اور عطف بیان اور اس کا معطوف دونو اپنی اپنی جگہ مقصود رہتے ہیں ؎

خاص کا عطف عام پر (تجرید)

اس عطف کا نام تجرید ہے ۔ گویا خاص عام سے بلحاظ تفضیل منفرد الذکر کیا گیا ہے ۔ قولہ حافِظُوا علی الصّلوٰتِ والصّلٰوۃ الوسطیٰ ۔ وقولہ وَلْتَکُنْ مِنکُمْ امّۃٌ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عَنِ المُنکَرِ ؎

اس جگہ خاص و عام سے وہ دو امر مراد ہیں ۔ جن میں سے پہلا امر دوسرے امر کو شامل ہوتا ہے ۔ اور اصطلاحی خاص و عام مقصود نہیں ؎

عام کا عطف خاص پر

غرض اس سے تعمیم اور عام کی حالت کا ملحوظ رکھنا ہے ۔ مثلاً انَّ صلاتی ونسکی و

مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ - کہ نسک بمعنی عبادت ہے اور وہ صلاۃ سے عام ہے -

ایضاح بعد الابہام - غرض اس سے ایک معنی کو دو صورتوں میں ادا کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ بھی کہ وہ معنے نفس میں از حد جاگزیں ہوجاتے ہیں - رَبِّ اشرح لی صدری - کہ صدری اس طلب کی تفسیر ہے - جو اشرح کے معنے سے سمجھی جاتی ہے ؎

تفسیر - غرض اس سے التباس و خفا کے خوف کا رفع کرنا ہے - قولہ مثل عیسےٰ کمثل آدم خلقہ من ترابٍ - اس میں خلقہ اور اس کا مابعد مثل کی تفسیر ہے - و قولہ - لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیہم بالمودۃ اس میں تلقون سے الخ تفسیر ہے اولیاء بنائے جانے کی -

کہا ہے کہ جسوقت کوئی جملہ تفسیر ہوتا ہے اس وقت اُسے ملائے بغیر صرف اس کے ماقبل پر وقف کرلینا اچھا نہیں ؎

اسم ظاہر کو اسم مضمر کی جگہ لانا - اس میں چند فوائد مدنظر ہوتے ہیں -

(۱) تقریر (قرار دینا) و تمکین (جگہ دینا - استوار بنانا) - قولہ تعالےٰ - قل ھو اللہ احدٌ - اللہ الصمدُ - کہ اس کی اصل ھو الصمد ہے - وقولہ - بالحق انزلنٰہ وبالحقّ نزل - وقولہ یقولون ھو من عند اللہ وما ھو من عند اللہ -

(۲) قصد تعظیم کے لئے - یعلمکم اللہ واللہ بکلّ شیءٍ علیمٌ - وقولہ وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشھوداً -

(۳) بغرض اہانت و تحقیر - اولئک حزب الشیطٰن الا ان حزب الشیطٰن ھم الخٰسرون

(۴) رفع التباس - جہاں ضمیر اس بات کا وہم دلاتی ہو - کہ وہ اول کے سوائے دوسری چیز ہے قولہ - قل اللّٰھم مالک الملک توتی الملک - اگر یہاں توتیہ کہا جاتا - تو اس سے یہ وہم پیدا ہوتا کہ ضمیر کا رجوع پہلے ملک کی طرف ہے - جو کہ مالک الملک میں ہے - وقولہٗ یظنّون باللہ ظنّ السوء علیہم دائرۃ السّوءِ وقولہ - فبدأ باوعیتھم قبل وعاء اخیہ ثم استخرجھا من وعاء اخیہ - یہاں پر منہ نہیں فرمایا - تاکہ رخ کی طرف ضمیر عود کرنے کا وہم نہ پیدا ہوجائے اور یہ بات ایسی ہوجائے - کہ گویا یوسف علیہ السلام بذاتِ خود اس پیمانہ کے نکلنے کی طلب کررہے ہے

حالانکہ صورت واقعہ اس کے خلاف ہے - کیونکہ خود یوسف علیہ السلام کا پیمانہ کی تجسّس میں مصروف ہونا ان کی ظاہرداری کے خلاف ہے - لہذا یہاں پر لفظ ظاہر اس بات کی نفی کے لئے اعادہ کیا گیا - اور من وعائہ اسواسطے نہیں کہا - تاکہ ضمیر یوسفؑ کی طرف عود کرنیکا وہم نہ پیدا کرے - کیونکہ استخرجہا کی ایک ضمیر ان کی طرف عاید ہوچکی تھی -

(۵) سامع کو مرعوب و ہیبت زدہ بنانے کے لئے - قولہٗ ان اللہ یامرکم بالعدل

(۶) تحریص و ترغیب یعنے ماحور کی ترغیب کی تقویت مدنظر ہوتی ہے - قولہ - فاذا عزمت فتوکل علی اللہ - ان اللہ یحبّ المتوکّلین -

(۷) بات کو پھیلا کر اور بڑا کرکے بتانا - ھل اتی علی الانسان حینٌ من الدّھر لم یکن شیئاً مذکوراً -

(۸) تلذّذ - یعنے شے کے ذکر سے لذّت حاصل کرنا - قولہ - واورثنا الارض نتبوّءُ من الجنۃ - اس میں منہا نہیں کہا گیا - اسی واسطے ارض کے لفظ سے جنّۃ کیطرف عدول کیا ہے

(۹) ظاہر سے بواسطہ وصف توصّل چاہنا قولہ - فامنوا باللہ ورسولہ النبی الامّی الذی یومن باللہ - یہاں آمنوا باللہ و بی نہیں فرمایا - کہ غرض اس سے اظہار اس امر کا ہے کہ جس شخص پر ایمان لانا اور جسکی پیروی کرنی واجب ہے - وہ ان صفات سے متصف ہے اور اگر اس کی جگہ بی کہا جاتا - تو اس وقت یہ فائدہ فوت ہوجاتا -

(۱۰) علّت حکم پر تنبیہ کرنا - فبدّل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لھم - قولہٗ - فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً فان اللہ عدوٌّ للکفرین - یہاں عدوٌّ لھم نہیں فرمایا - کہ اس سے یہ تنبیہ مقصود ہے - کہ جو شخص ان (رسولوں) سے عداوت رکھتا ہے وہ کافر ہے - اور اللہ تعالےٰ اس سے بوجہ اس کے کفر ہی کے دشمنی رکھتا ہے ؎

(۱۱) بغرض قصد خصوص - قولہ - التی ھاجرن معک وامرأۃً مومنۃً ان وھبت نفسھا للنبیّ ان اراد النبی ان یستنکحھا -

(۱۲) استیناف یعنے اس میں یہ اشارہ ہوتا ہے - کہ جملہ پہلے جملے کے حکم میں داخل نہیں - قولہ - فان یشاء اللہ یختمُ علیٰ قلبک ویمح اللہُ الباطل - کریمح اللہ حکم شرط میں

داخل نہیں - بلکہ وہ استیناف ہے ؎

(۱۳) رعایت کلمات متجانسہ - قولہ - قل اعوذ برب الناس - ملک الناس - الٰہ الناس

(۱۴) ترصیع و ترکیب میں الفاظ کے ہموزن ہونے کی مراعاۃ - ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخریٰ ؎

(۱۵) اسم ظاہر کسی ایسی ضمیر کا احتمال کرے - جو کہ ضروری ہے - قولہ - اتیا اھل قریۃ استطعما اھلھا - اگر اس جگہ استطعماھا کہا جاتا - تو یہ اسواسطے صحیح نہ ہوتا کہ خضر و موسےٰ نے گاؤں سے کھانا طلب نہیں کیا تھا - اور اگر استطعماہم کہا جاتا - تو بھی صحیح نہ ہوتا - کیونکہ استطعما قریہ کی صفت ہے - اور قریہ نکرہ ہے اور یہ اہل قریہ کی صفت نہیں - اس لئے ضروری ہوا - کہ اہل میں کوئی ضمیر ہو - جو قریہ کی طرف عود کرے - اور یہ بات بغیر ظاہر طور پر تصریح کرنے کے اور کسی طرح ممکن نہیں -

ایغال - کسی خاص غرض کے لئے کلام کے ساتھ ایک زاید جملہ لانا - مثل قولہ - یٰقوم اتبعوا المرسلین اتبعوا من لا یسئلکم اجراً وھم مھتدون - وھم مھتدون - جملہ ایغال ہے - اسواسطے کہ اگر یہ نہ کہا جاتا - تاہم کلام کے معنے پورے ہوجاتے - اس لئے کہ رسول لامحالہ راہ یافتہ ہوتے ہیں - لیکن چونکہ اس جملہ میں لوگوں کو رسولوں کی پیروی پر اُبھارنے اور ان کو اس بات کی ترغیب دلانے میں ایک قسم کا زاید مبالغہ تھا - اسواسطے اسے وارد کیا ؎

تذئیل - وہ یہ ہے - کہ ایک جملہ کے پیچھے دوسرا جملہ لایا جائے - جو کہ پہلے جملے کے منطوق یا مفہوم کی تاکید کیواسطے اس کے معنے پر شامل ہو - تاکہ جس شخص نے جملہ اُولیٰ کو نہیں سمجھا اس لئے معنیٰ کو ظاہر کردے - اور جس شخص نے وہ معنے سمجھ لئے ہیں - ان کے نزدیک ان معنوں کا تقرر کرے - مثلاً ذٰلک جزینٰھم بما کفروا وھل نجازی الا الکفور - قل جاء الحق وزھق الباطل - ان الباطل کان زھوقا ؎

طرد و عکس - یہ اس بات کا نام ہے - کہ دو کلام اسطرح لائے جائیں - جن میں سے پہلا کلام اپنے منطوق کے ذریعہ سے دوسرے کلام کے منطوق و مفہوم کی تقریر کرتا ہو - اور یا اس کے برعکس ہو - قولہ - لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون ؎

تکمیل - جسے احتراس بھی کہتے ہیں - ایسے کلام میں جو خلاف مقصود ہونے کا وہم دلاتا ہو کوئی ایسی بات لائی جاوے - جو کہ اس وہم کو رفع کرے - مثلاً اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ علے الکافرین - اگر اس جگہ اذلۃ پر کفایت کرلیجاتی - تو اس سے وہم ہوتا - کہ یہ بات انکی کمزوری کے باعث ہے - لہٰذا خداوند نے اس وہم کو اپنے قول اعزّۃ سے رفع کردیا - و قولہ - اشدّاء علے الکفار رُحَمَآءُ بینھم - اگر اس میں صرف اَشِدّاء پر کفایت کرلیجاتی تو وہم پیدا ہوتا - کہ یہ بات ان کی بدمزاجی کے باعث سے ہے ؎

تتمیم - ایسے کلام میں جو کہ غیر مراد کا وہم نہ دلاتا ہو - ایک فضلہ (متعلق جملہ) اس طرح کا لایا جائے جو کہ کسی نکتہ کا فائدہ دے - مثلاً قولہٗ - وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ میں علے حبّہٖ متعلق مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے - اور اس کے یہ معنے ہیں - کہ وہ لوگ باوجود طعام کی محبت کے - یعنے اسکی اشتہا و خواہش کے مسکینوں کو کھانا کھلاتا بہت ہی زائد ثواب کا موجب - و قولہ واتی المال علے حبّہٖ - و قولہ - ومن یعمل من الصٰلحٰت وھو مؤمن میں جملہ وھو مؤمن تتمیم کے لئے آیا ہے -

استقصاء - اور وہ اسبات کا نام ہے - کہ متکلم ایک معنی کو لے کر اس کا استقصاء (کرید) کرے - اور اس کے تمام ذاتی صفات کی جستجو اسطرح کرے - کہ اس شخص کے بعد کوئی دوسرا آدمی اس معنی کو استعمال کرے - تو اسے کوئی گنجائش زبان کھولنے کی نہ ملے اور اس معنے کے تمام عوارض و لوازم بیان کردے - مثلاً قولہ - اَیَوَدُّ اَحَدُکُم ان تکون لہٗ جنّۃ من نخیل واعناب تجری من تحتھا الانھار فیھا من کل الثمرات واصابہ الکبر ولہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَاءُ فَاَصَابَھَا اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فاحترقت کذٰلک یُبَیِّنُ اللہ لکم الاٰیات لعلکم تتفکرون -

اگر جنّۃ ہی پر کفایت کرلیجاتی - تو بھی ہو سکتا تھا - مگر اس پر توقف نہیں کیا گیا - بلکہ اس کی تفسیر میں من نخیل واعناب (یعنے کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں کا باغ) فرمایا - کیونکہ ایسے باغ کے مالک کو اس کی تباہی سے سخت رنج پہنچتا ہے - پھر اس پر یہ کہا - کہ اس کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں) کی صفت کا اضافہ کیا - اور اس کے بعد مزید تکملہ وصف کے طور پر

ارشاد فرمایا۔ فیہامن کل الثمرات کہ اس میں ہر طرح کے میوے موجود ہیں۔ غرض باغ میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ ان سبھوں کو بیان کر دیا۔ تاکہ اس کی تباہی پر سخت رنج و تاسف ہو سکے اور بعدہٗ مالک باغ کی صفت میں فرمایا۔ واصابہ الکبر۔ کہ اسکا بڑھاپا آگیا ہو۔ پھر ایسی بات کے ساتھ جو مصیبت کی بڑائی کا موجب بنے۔ اسبارہ میں معنی کی اور بھی جستجو فرما کر مالک باغ کی بڑھاپے کی حالت بیان کرنے کے بعد فرمایا ولہ ذُرِّیّۃ۔ کہ اس کی اولاد بھی ہے۔ اور اس پر اکتفا نہ فرما کر ذریّت کی صفت ضعفاء کے ساتھ بھی کر دی۔ بعد ازاں باغ کے استیصال و تباہ کرنے کا ذکر کیا۔ جو کہ اس مصیبت زدہ شخص کا تمام و کمال سرمایہ اور بسر اوقات کا ذریعہ تھا۔ اور چشم زدن میں اس کے ہلاک کر ڈالنے کا بیان فرماتے ہوئے کہا۔ فَاَصَابَہَا اِعْصَارٌ پھر اس پر بگولے سخت آندھیاں آئیں۔ مزید برآں یہ فرمایا۔ فیہ نارٌ کہ اس میں آگ ہے۔ اس پر اور زور دیا۔ کہ پھر اس نے جلا کر خاک سیاہ کر ڈالا۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا تھا۔ کہ شاید بگولے کی آگ کمزور ہو۔ اور اس سے باغ کو چنداں نقصان نہ پہونچا ہو۔ غرض اس کلام میں کامل استقصاء ہے۔

استقصاء۔ تتمیم۔ تکمیل میں فرق

تتمیم کا ورود ناقص معنوں پر اس لئے ہوتا ہے۔ کہ وہ معنے تمام ہو جائیں اور اس کے آنے سے وہ معنے مکمّل ہو جاتے ہیں۔ اور تکمیل کا ورود ایسے معنوں پر ہوتا ہے۔ جس کے اوصاف تمام ہوں۔ اور استقصاء کو ورود تام اور کامل معنے پر ہوتا ہے۔ پس وہ اس معنے کے لوازم۔ عوارض۔ اسباب۔ اوصاف کی کرید کر کے تمام ان باتوں کا استیعاب کر لیتا ہے۔ جن پر اس معنے کے متعلق خیال جا سکے۔ یہاں تک کہ پھر کسی شخص کو اس معنے میں گفتگو کی گنجائش یا کوئی بات پیدا کرنے کی جگہ باقی نہیں رہتی۔

اعتراض یا التفات

یہ اس بات کا نام ہے۔ کہ ایک کلام یا دو کلاموں کے مابین دفع ابہام کے سوا کسی اور نکتہ کے لئے ایک جملہ یا ایک سے زاید جملے اس طرح کے لائیں۔ جن کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو۔ قولہٗ۔ وَیَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَہٗ وَلَہُمْ مَّا یَشْتَہُوْنَ۔ اس جگہ

سُبْحَانَہٗ خداوند کی بیٹیاں ہونے سے اس کی تنزیہ اور خداوند کے لئے بیٹیاں ٹھہرانے والوں کی خواری کرنے کے لئے بطور جملہ معترضہ کے وارد ہوا ہے۔ اور قولہ لَتَدْخُلُنَّ المسجد الحرام انشاء اللّٰہ اٰمنین میں انشاء اللہ کا جملہ معترضہ ہے۔ اور برکت حاصل کرنے کی غرض سے لایا گیا ہے۔

اعتراض در اعتراض کی مثال فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ۔ کہ یہاں قسم اور اس کے جواب کے مابین قولہ تعالیٰ وانّہ لقسمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عظیم۔ معترض ہو کر مقسم بہ کی تعظیم اس کے جلال کی تحقیق اور اس بات کو معلوم کرانے کا فائدہ دیتا ہے۔ کہ جس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ اس کی عظمت ایسی ہے۔ جس کو وہ لوگ نہیں جانتے۔

تعلیل۔ اس کا فائدہ۔ تقریر (ایک بات کو قرار دینا) اور ابلغیت (حد درجہ کو پہنچا دینا) ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی طبیعتیں ایسے احکاموں کے قبول کرنے پر آمادہ ہوا کرتی ہیں جنکی علّت ان کے سوائے اور امور کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔ اور قرآن مجید میں بیشتر تعلیل اس طرح آتی ہے۔ کہ کسی ایسے سوال کا جواب مقدر کیا گیا ہو۔ جس سوال کو جملہ اولیٰ نے چاہا ہے۔ اور تعلیل کے حروف یہ ہیں۔ ل۔ اِن۔ اَن۔ اذ۔ ب۔ کَے۔ من لعل۔ اور ان چیزوں میں سے جو کہ تعلیل کی مقتضی ہوتی ہیں۔ ایک حکمت کا لفظ ہیں۔ مثلاً قولہ۔ حکمۃ بالغۃ۔ (اعلےٰ درجہ کی حکمت)

انبیاء علیہم السلام کی کنیتیں والقاب و اسماء جو قرآن شریف میں آئے ہیں۔

قرآن مجید میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے پچیس نام آئے اور وہ مشاہیر انبیاء علیہم السلام ہیں۔

(۱) آدم علیہ السلام حضرت ابوالبشر۔ اور کہا ہے۔ آدم بروزن افعل ادمۃ سے صفت مشتق ہے۔ اسی لئے غیر منصرف ہے۔ اور کہا ہے۔ یہ سریانی لفظ ہے۔ اصل ادام بر وزن خادام دوسرے الف کو حذف کر کے معرب کر لیا گیا ہے۔ ثعالبی۔ عبرانی زبان میں ادام مٹی کو کہتے ہیں۔

(۲) نوح علیہ السلام اسم معرّب۔ سریانی زبان میں نوح بمعنے شاکر آیا ہے۔ اصل نام آپ کا عبدالغفّار ہے۔ کثرت نوحہ وزاری کے باعث نوح کے نام سے موسوم ہوئے۔ چالیس برس کی عمر میں شرف نبوّت سے مشرف ہو کر ۹۵۰ سال تبلیغ رسالت میں کوشاں رہے۔ واقعۂ طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے ہیں۔

(۳) ادریس علیہ السلام۔ سریانی اسم ہے۔ یا عربی ہے۔ اور لفظ دراسہ (درس و تعلیم دینا) سے مشتق ہے۔ آپ صحف آسمانی کا درس بکثرت دیا کرتے تھے۔ جامع کوفہ کے قریب آپ کا معبد ہے۔

(۴) ابراہیم علیہ السلام سریانی زبان کا اسم ہے۔ بمعنے اب رحیم۔ (مہربان باپ) اور کہا ہے۔ ابرہمہ سے مشتق ہے۔ اور اس کے معنے ہیں شدۃ النظر۔ دمشق سے شمال کیجانب تین میل کے فاصلہ پر پہاڑ کے اوپر ایک بستی (برزہ) ہے۔ جس میں آپ پیدا ہوئے ہیں۔ اور وہ ایک غار سی ہے۔ اب وہاں ایک عالیشان مسجد بنی ہوئی ہے۔ اور زیارتگاہ ہے۔ اس کے قریب ایک قریہ (بیت الاہیہ) ہے۔ اس میں وہ کنیسہ ہے۔ جس میں آزر بُت تراشا کرتا تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام انہیں توڑ ڈالتے تھے۔ موصل و حلب کے درمیان حرّان ایک قدیم بستی ہے۔ اس سے ۹ میل کے فاصلہ پر ایک عالیشان مشہد بنا ہوا ہے۔ جو حضرت سارہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معبد کہلاتا ہے۔

(۵) اسمٰعیل علیہ السلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے میزاب مکہ کے قریب آپ کی قبر کا نشان ہے۔ جس پر ایک سبز پتھر محراب کی شکل کا لگا ہوا ہے۔

اور رکن عراقی بیت کے قریب آپ کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کا مدفن ہے۔ اس پر بھی ایک سبز پتھر چھوٹا سا لگا ہوا ہے۔

(۶) اسحاق علیہ السلام عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ بمعنے ضحاک (خندہ پیشانی)۔

(۷) یعقوب علیہ السلام۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے تھے اور آپ کے بارہ فرزند تھے۔ یوسف۔ روبیل۔ شمعون۔ لاوی۔ یہودا۔ دانی۔ نفتانی۔ کاد۔ یاشر۔ الیشاجر۔ رابلون۔ بنیامین۔ (انہیں پر اسباط کا اطلاق ہوتا ہے)۔

(۸) یوسف علیہ السلام اسم عجمی۔ مصر سے اوپر کی جانب براہ قوص نیل کے کنارہ پر دو دن کے فاصلہ پر ایک غیر آباد موضع ہے۔ جس میں یوسف علیہ السلام کا سجن تھا۔ اور وہیں ایک وسیع اھرا (غار) ہے۔ جس میں آپ نے غلّہ جمع کیا تھا۔ اسوقت وہ بالکل کھنڈر ہے۔

(۹) لوط علیہ السلام۔

(۱۰) ہود علیہ السلام۔

(۱۱) صالح علیہ السلام۔ جب قوم عاد ہلاک ہوئی۔ اور قوم ثمود نے ان کی جگہ سنبھالی۔ تو حضرت صالح علیہ السلام عالم جوانی میں ان کے پاس رسول بنا کر بھیجے گئے۔ اور قوم ثمود عرب سے ہے۔

(۱۲) شعیب علیہ السلام خطیب الانبیاء۔ قوم مدین اور اصحاب ایکہ۔ اصحاب الرس۔ تینوں قوموں کے رسول تھے۔

(۱۳) موسےٰ علیہ السّلام۔ سریانی زبان کا اسم ہے۔ قبطی زبان میں مو پانی اور شا درخت کو کہتے ہیں۔ چونکہ آپ کا صندوق نہر میں درختوں کی لٹکتی ہوئی شاخوں کے درمیان پایا گیا تھا۔ اس لئے آپ موشا کے نام سے پکارے گئے۔ مصر کی اوپر کی جانب براہ قوص نیل کے کنارے پر ایک متوسط آبادی کا قریہ (اسکہ) ہے۔ جس میں حضرت موسےٰ علیہ السلام تولّد ہوئے ہیں۔ اور وہیں سے آپ کی والدہ نے تابوت میں رکھ کر ان کو نیل میں بہا دیا تھا۔ سنہ ولادت ۲۳۰ سال بعد قدوم حضرت یعقوب علیہ السلام بمصر موافق ۴۲۴ سال بعد ولادت حضرت ابراہیم علیہ السلام ۳۹ سال مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس رہے ہیں۔

(۱۴) ہارون علیہ السلام بمعنے ہر دلعزیز۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے بھائی اور ان سے ایک سال عمر میں بڑے ہیں۔

(۱۵) داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے دوسرے بادشاہ۔ عہد حکومت چالیس سال۔

(۱۶) سلیمان علیہ السلام۔ بنی اسرائیل کے تیسرے اولوالعزم بادشاہ تیرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے اور چار سال بعد بیت المقدس کی تعمیر شروع کی۔

(۱۷) ایوب علیہ السلام ستر سال کی عمر میں مبتلائے آزمائش ہوئے۔ اور سات سال بعد

خلاصی پائی - عمر (۱۹۳) سال ؛

(۱۸) ذوالکفل علیہ السلام - اصل نام بشر ۷۵ سال ؛

(۱۹) یونس علیہ السلام -

(۲۰) الیاس علیہ السلام - ہمزہ قطعی ہے - ال یسین بھی آپ کا نام ہے ؛

(۲۱) زکریا علیہ السلام - جب آپ کو حصول فرزند کی بشارت دی گئی - اس وقت آپ کی عمر ۹۲ سال کی تھی ؛

(۲۲) المسیح علیہ السلام اسم عجمی یا وسع یسع سے منقول عربی اسم ہے ؛

(۲۳) یحییٰ علیہ السلام - عیسےٰ علیہ السلام سے چھ ماہ قبل پیدا ہوئے بچپن ہی میں خلعت نبوت سے سرافراز ہوئے - آخر ظلم سے شہید کر دیئے گئے - اسم عربی غیر منصرف ؛

(۲۴) عیسےٰ علیہ السلام - حمل میں رہنے کی مدت دو یا تین ساعت - رفع کے وقت آپ کی عمر ۳۳ سال کی تھی ؛

(۲۵) خاتم الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید میں آپ کے نام کثرت سے لئے گئے ہیں - از انجملہ احمد و محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ؛

قرآن مجید میں بتوں کے نام

ود - سواع - یغوث - یعوق - نسر - یہ قوم نوح علیہ السلام کے بت ہیں ؛

لات - عزےٰ - مناۃ قوم قریش کے اصنام ہیں ؛

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے - کہ ود - سواع - یغوث - یعوق - نسر قوم نوح علیہ السلام کے نیک لوگوں کے نام ہیں جب وہ مر گئے - تو قوم نے ان کی یادگار میں بت بنائے - اور انہیں کے نام سے موسوم کئے - آہستہ آہستہ جب اس بات کا علم اٹھ گیا - تو وہ معبود بن گئے - اور ان کی پرستش شروع ہو گئی ؛

ابن اسحاق کہتے ہیں - بنی اسمٰعیل میں احجار کی عبادت اس طرح شروع ہوئی - کہ ان میں سے جب کوئی سفر کرتا - تو حرم مبارک کا ایک پتھر ساتھ لے جاتا مشکل کے وقت اس پتھر

کے گرد مثل بیت اللہ کے طواف کرتا - پھر آہستہ آہستہ وہ بات جاتی رہی - اور ہر ایک خوشنما سفید پتھر کی پرستش شروع ہو گئی ؛

ابن ہشام لکھتے ہیں - عمر بن لحی کسی کام کیلئے مکہ سے شام کو گیا - حدود بلقا میں دیکھا - کہ لوگ بتوں کی عبادت کرتے ہیں - پوچھا - یہ کیا کرتے ہو - انہوں نے کہا - خشک سالی میں ہم ان سے پانی مانگتے ہیں - وہ بارش برساتے ہیں سختیوں میں امداد چاہتے ہیں - وہ مدد کرتے ہیں - پھر عمران سے ہبل نامی ایک بت لیکر آیا - اور مکہ میں نصب کر کے لوگوں کو اس کی پرستش پر متوجہ کیا - پس یہ پہلا شخص ہے جس نے دین اسمٰعیل میں تغیر کیا - اور بتوں کو نصب کیا ؛

پھر اساف اور نائلہ نامی دو اور بت بنائے گئے - ہبل بیت اللہ کے اندر اور اساف و نائلہ زمزم کے قریب تھے - اور قوم کی یہ عادت قائم ہوئی - کہ جب سفر جاتے - تو بت کو ہاتھ لگا کر نکلتے - اور واپس آتے - تو اس وقت بھی ان کو ہاتھ لگاتے - اور کچھ نذر بھی دیتے ؛

سواع - ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کا رہاط میں نصب کیا ہوا بت ہے - اس کو عمرو ابن العاص نے توڑا ہے ؛

ود - کلب بن وبرہ بن ثعلب قضاعی کا دومتہ الجندل میں نصب کیا ہوا بت ہے ؛

یغوث - اسکو انعم وطی بن اُود سبائی نے جرش میں نصب کیا تھا ؛

اشاد - فرعون کے بتوں سے ایک بت کا نام ہے - ما اھدیکم سبیل الرشاد -

یعوق - ہمدانیوں کا بت ہے - ہمدان یمن میں قائم تھا ؛

بعل - قوم الیاس کے بت کا نام ہے - اصل نام بعل توراۃ میں ہے - کہ مدین بعل دیوتا کی پوجا کرتے تھے - یہ بت سونے کا تھا - چودہ ہاتھ لمبا چار منہ تھے - خوشبودار لکڑیاں سامنے جلائی جاتی تھیں - لوگ اپنی اولاد اس کے سامنے آگ میں ڈال دیتے تھے - یہ منت تھی ؛

ان کے سوائے اور بھی بت ہیں - جن کی پرستش عرب میں ہوا کرتی تھی ؛

عم انس - خولانیوں کا بت - قائم کردہ خولان قضاعی سبائی ؛

سعد - بنی ملکان بن کنانہ کا بت ہے - جو ان کے جنگل میں نصب تھا ؛

بتوں کے سوائے اہل عرب نے کعبۃ اللہ کی مانند طواغیت بھی بنائے تھے - یہ چھوٹے

چھوٹے حجرے تھے۔ جن کی تعظیم کعبۃ اللہ کی شل کی جاتی تھی۔ ان کے لئے شل کعبہ اللہ سدنہ (متولی امور) اور حجاب بھی تھے۔ ان حجروں کے گرد طواف کیا جاتا تھا۔ اونٹ ذبح ہوتے تھے۔ لیکن کعبۃ اللہ کی عظمت و فضیلت زیادہ مانی جاتی تھی۔ کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا مقام تھا؛

یہ طواغیت کہیں خالی حجرے تھے۔ اور کہیں کہیں ان میں بُت بھی رکھے ہوئے تھے۔ طاغوت عزیٰ قریش اور بنی کنانہ کا بُت ہے۔ بمقام نخلہ نصب تھا۔ اس کے سدنہ بنی شیبان سلیمی حلفائے بنی ہاشم تھے۔ یہ ایک بُت تھا۔ ایک درخت کے نیچے چاروں طرف چہاردیواری تھی۔ اس کو خالد بن ولید نے بحکم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاٹا۔ تو اس میں سے ایک عورت شیطانہ نکلی۔ پریشان حال بکھرے ہوئے بال سر پہ ہاتھ رکھے ہوئے وَیل پکارتی تھی۔ حضرت خالد نے اپنی تلوار سے اُسے بھی کاٹ ڈالا تھا۔ وہ کہتی تھی۔ یا عزیٰ کفرانک لاسبحانک انی رایت اللہ قد اھانک۔ اس پر جو الف لام داخل ہوتا ہے۔ وہ شل الف و لام لات کے زائد غیر عوض اس قبیل سے ہے۔ جو اعلام منقولہ پر داخل ہوتا ہے؛

طاغوت لات۔ بنی ثقیف کے بت کا نام ہے۔ طائف میں نصب کیا ہوا تھا۔ اس کے سَدَنہ و حجاب میں معتب ثقفی تھے۔ دراصل یہ ایک سویقالت کرنے والے کی یادگار میں قائم ہوا تھا۔ اس لئے لات کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ ایک سفید پتھر تھا اور اس پر عمارت بنی ہوئی تھی؛

مناۃ۔ اوسیوں۔ خزرجیوں اور ان کے حلفاء اہل یثرب کے طاغوت کا نام ہے۔ ساحل بحر پر نواح مشلّل میں بمقام قدید ایک چٹان پر نصب کیا ہوا تھا۔ جن کو ابوسفیان بن حرب یا علی کرم اللہ وجہہ کی سرکردگی میں سعد بن ابی زید اشہلی نے منہدم کیا۔ اس بُت میں سے سیاہ اندام ایک عورت برآمد ہوئی تھی۔ جس کو سعد نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا؛

طاغوت ذوالخلفہ دوس اور خثعمیوں کے بُت کا نام ہے۔ بمقام حیلہ نصب تھا۔

جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے اسے گرایا ہے؛

فلس۔ قبیلہ طی۔ سلمی اور رجاء وغیرہم کا بُت ہے۔ مقام جبل بنی طی میں نصب تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسے گرایا۔ اس میں سے دو تلواریں برآمد ہوئی تھیں۔ ایک کا نام سوب اور دوسری کا مخذم تھا۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی گئیں۔ اور آپ صلعم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ہبہ فرمادیں؛

رئام۔ حمیرون اور یمنیوں کا طاغوت یا بُت ہے۔ ضحا میں نصب تھا؛

رضا۔ بنی ربیعہ بن کعب بن سعد بن تیم کا طاغوت ہے۔ مستوغر بن ربیعہ بن کعب بن سعد نے اس کو منہدم کیا؛

ذوالکعبات۔ طاغوت بنی بکر و بنی تغلب مقام سندر میں نصب تھا۔ وغیرہ؛

مدارج و طبقاتِ مفسّرین

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے دس صحابی مفسّر مشہور ہیں :۔

(۱) ابو بکر صدیق رضؓ (۲) عمر رضؓ بن الخطاب (۳) عثمان رضؓ بن عفان (۴) علی بن ابی طالب (۵) عبداللہ بن مسعود۔ (۶) عبداللہ بن عباس۔ (۷) ابی بن کعب (۸) زید بن ثابت (۹) ابو موسےٰ اشعری۔ (۱۰) عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہم ؛

خلفائے اربعہ میں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تفسیر کے بارے میں بکثرت آثار مروی ہیں۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن العباس ابو المفسرین (ترجمان القرآن۔ حبر۔ بحر) سے تفسیر قرآن اور معانی قرآن کی روائتیں کثرت سے آئی ہیں۔ سب سے پہلے آپ مفسّر کلام مجید ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ دعا دی تھی۔ کہ اے اللہ تو اس کو دین میں فقیہہ (سمجھ رکھنے والا) بنا۔ اور اس کو تاویل کا علم عطا کر اور حکمت عطا فرما ؛

تابعین میں سے ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔ تفسیر کے سب سے بڑے عالم اہل مکہ ہیں۔ اس واسطے کہ وہ ابن عباس کے رفقا ہیں۔ مثل مجاہد و عطا بن رباح۔ عکرمہ (ابن عباس کے آزاد کردہ غلام) سعید بن جبیر۔ طاؤس وغیرہ۔ ایسے ہی کوفہ میں ابن مسعود کے اصحاب اور اہل مدینہ میں زید بن اسلم جس سے اس کے بیٹے عبدالرحمن بن زید اور مالک بن انس نے تفسیر اخذ کی ہے۔ ان سب میں سے مجاہد بڑھے ہوئے ہیں۔ فضل بن میمون کا قول ہے۔ کہ میں نے مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے۔ کہ میں نے تیس مرتبہ قرآن کو ابن عباس کے پیش کیا ہے اور تین مرتبہ اس طرح پر پڑھا ہے۔ کہ اس کی ہر ایک آیت پر ٹھہر کر اس کی بابت دریافت کیا کرتا تھا۔ کہ وہ کس بارے میں نازل ہوئی اور کیونکر تھی۔ ایسے ہی سعید بن جبیر کی تفسیر قابل اعتماد ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ تابعین میں سے چار شخص بہت بڑے عالم ہیں۔ عطا بن ابی رباح۔ سعید بن جبیر۔ عکرمہ۔ حسن بصری۔ اور سفیان ثوری فرماتے ہیں۔ تم تفسیر کو چار شخصوں سے اخذ کرو۔ مجاہد سے عکرمہ سے سعید بن جبیر و ضحاک سے ؛

مشہور مفسّر تابعین | پس مشہور مفسّر تابعین سے حسن بصری۔ عطا بن ابی رباح۔ عطا بن

ابی سلمہ خراسانی۔ محمدؐ بن کعب القرظی۔ ابو العالیہ۔ ضحاک بن مزاحم۔ عطیہؒ العوفی۔ قتادہ زید بن اسلم۔ مرۃ الہمدانی۔ اور ابو مالک۔ سعید بن جبیر۔ عکرمہ ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین ؛

ان کے بعد ربیع بن انس۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا درجہ ہے۔ پس یہ حضرات قدمائے مفسّرین سے ہیں۔ اور ان کے اقوال اس قسم سے ہیں۔ کہ انہوں نے ان کو اصحاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے اور پایا ہے ؛

مثلاً تفسیر عطا بن ابی سلمہ خراسانی۔ تفسیر ابو العالیہ۔ تفسیر ضحاک وغیرہ کہ ان میں صرف صحابہ رضؓ کے قول تک مدارِ تفسیر قرار دیا ہے۔ اسی زمانہ میں یہ قاعدہ منضبط ہو گیا تھا۔ کہ قرآن شریف کی تفسیر یا تو خود قرآن کی دوسری آیت سے کی جائے۔ یا صاحبِ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک سے جہاں یہ دونو باتیں نہ پائی جائیں۔ وہاں صحابہ کے اقوال سے تفسیر کیجائے۔ کیونکہ انہوں نے اکثر آیتوں کے مطالب کو خود جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی کوشش و غور سے حل کیا ہے۔ اور ان کے کانوں میں یہ عبرتناک آواز پہنچی ہوئی تھی۔ کہ تفسیر قرآن میں عقل کو دخل دینا وبال جان ہے۔ لہذا اس بات میں صحابی کا قول حدیث مرفوع کا حکم رکھتا ہے ؛

اس کے بعد ابن جریر۔ ابی حاتم ابن ماجہ حاکم بن مردویہ۔ ابن حبان۔ ابن المنذر وغیرہم ہیں۔ ان تمام حضرات کی تفسیریں صحابہ کرام۔ تابعین اور تبع تابعین کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے بعد جو تفسیریں تالیف ہوئیں۔ ان میں اکثر اسنادوں کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ جس سے قول صحیح اور غیر صحیح میں پورا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ ان تفسیروں میں مفسّرین نے اپنی رائے کو بھی دخل دیا ہے ؛

طبقاتُ القرّاء

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں یوں تو قرآن دان قراء (تعلیم قرآن دینے والے) بکثرت موجود ہیں۔ لیکن ان تمام میں سے وہ صحابہ جن سے قرآن کریم کے مسلسل سلسلے جاری ہوئے ہیں۔ اور تمام صحابہ کے مدار قرأت تسلیم شدہ ہیں۔ وہ سات ہیں۔

صحابہ میں تسلیم شدہ قاری عثمانؓ ابن عفان - علیؓ بن ابی طالب - ابیؓ بن کعب - زیدؓ بن ثابت - عبداللہؓ بن مسعود - ابو درداءؓ - ابو موسےٰ اشعری -

قرائے تابعین مدینہ ان لوگوں سے بکثرت تابعین نے قرآن کی تعلیم پائی منجملہ قراء تابعین کے مدینہ میں یہ لوگ تھے - ابن المسیب - عروہ - سالم - عمر بن عبدالعزیز - سلیمان - عطا - یہ دونو یسار کے فرزند ہیں - معاذ بن الحارث المعروف بمعاذ قاری - عبد الرحمٰن بن ہرمز الاعرج - ابن شہاب الزہری - مسلم بن جندب - زید بن اسلم ؎

قرائے تابعین مکہ مکرمہ عبید بن عمیر - عطا ابن ابی رباح - طاؤس - مجاہد عکرمہ - ابن ابی ملیکہ -

قرائے تابعین کوفہ کوفہ میں علقمہ - اسود - مسروق - عبیدہ - عمر بن شرحبیل - حارث بن قیس - ربیع بن خیثم - عمر بن میمون - ابو عبدالرحمٰن السلمی - زر بن حبیش - عبید بن نفیلہ سعید بن جبیر - نخعی - قتادہ ؎

قرائے تابعین شام شام میں یعنے دمشق میں مغیرہ بن ابی شہاب المخزومی - عثمان رضی اللہ عنہ کے شاگرد - خلیفہ بن سعد ابی درداء کے شاگرد ؎

پھر ایک گروہ کثیر نے قرأت میں اس قدر شہرت پائی - کہ وہ خود مستقل فن قرأت کے امام تسلیم کر لئے گئے - چنانچہ مدینہ میں ابو جعفر یزید - اور ان کے بعد شیبہ بن نصاع اور پھر نافع بن نعیم امام قرأت مشہور ہوئے ؎

اور مکہ میں عبداللہ بن کثیر - حمید بن قیس الاعرج - محمد بن ابی محیض امام مانے گئے ؎

کوفہ میں یحی بن وثاب - عاصم بن ابی النجود - سلیمان الاعمش یہ تینوں صاحب ہمعصر تھے اور بعد میں ہمزہ و کسائی نامور ہوئے ؎

بصرہ میں عبداللہ بن ابی اسحاق - عیسےٰ بن عمر - ابو عمر بن العلا - عاصم الجحدری - یہ چاروں صاحب ہمعصر ہیں - ان کے بعد یعقوب الحضرمی ہیں ؎

دمشق میں عبداللہ بن عامر - عطیہ بن قیس الکلابی - عبداللہ بن المہاجر - اور پھر یحی بن الحارث الاماری - اس کے بعد شریح بن یزید الحضرمی نامور قراء ہیں -

انہیں مذکورہ بالا اماموں میں سے سات امام فن قرأۃ کے تمام دنیا میں مشہور و

معروف ہیں - اور وہ حسب ذیل ہیں :-

مشہور آیمہ قرأت اور وہ سات ہیں

(۱) امام نافع - انہوں نے بہتر تابعیوں سے قرأت اخذ کی ہے - منجملہ ان کے ابو جعفر بھی ہیں ؎

(۲) امام ابن کثیر - انہوں نے عبداللہ بن اصائب صحابی سے تعلیم پائی ہے ؎

(۳) ابو عمر - ان کے تمام استاد تابعی ہیں ؎

(۴) ابن عامر - ابی درداء وغیرہ شاگردان عثمان سے تعلیم پائی ہے -

(۵) عاصم - ان کے استاد قرأت تابعی ہیں ؎

(۶) حمزہ - انہوں نے عاصم - اعمش - سبیعی - منصور بن المعتمر وغیرہ تابعین سے قرآن پڑھا ہے ؎

(۷) کسائی - حمزہ ابی بکر بن عیاش کے شاگرد ؎

اس کے بعد قاریان کلام مجید تمام دنیا میں پھیل گئے اور ہر زمانہ میں نامور و ممتاز ان میں سے ہوتے رہے ہیں ؎

بعض مشہور شہروں اور خاص خاص مقاموں کے نام جو قرآن مجید میں مذکور ہوئے ہیں اور اُن کی مختصر کیفیت

مکہ (بیت - بکہ - ام القرای)

کہا ہے مکہ - محاورہ عرب تمکمّت العظم - (جو کہ ہڈی میں مخ تھا میں نے جذب کر لیا) سے ماخوذ ہے - اس مناسبت سے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف بزور کھینچتا ہے ؎

اور بکہ ماخوذ ہے بکّ (ذلیل کرنا کوٹنا) ہے - چونکہ اس مقام پر بڑے بڑے گردن کشوں کی گردنیں جھکتی اور ان کے سر زمین پر گرتے ہیں - اس مناسبت سے اس مقام کو بکہ کہتے ہیں اور یا وہ ماخوذ ہے التباک (اژدحام) سے یہ شہر حجاز کا دار الخلافہ حضرت ابراہیم کی بنا، حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم جد عرب کی ہجرت گاہ - مولد حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین سید ولد آدم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے - اس کا شمالی سلسلہ جبل فلق - جبل قیقعان - جبل ہندی - جبل لعلع - جبل

کداء سے مرکب ہے۔ جبل کداء کی راہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بروز فتح مکہ مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ جنوبی سلسلہ میں جبل ابو حدیدہ جبل کدی۔ جبل ابی قبیس وغیرہ اور مشرق میں جبل ابی قبیس اور اس کے پیچھے جبل خندمہ اور مغرب میں جبل عمر واقعہ ہے۔ حضرت مسیح سے ڈھائی ہزار برس پہلے یہ جگہ کاروان تجارت کی گذرگاہ تھی۔ عہد اسلام میں شہر کے علاوہ اسمٰعیلی قبیلے اس کے آس پاس بھی آباد تھے۔ جنوب میں جو پہاڑیاں ہیں۔ وہ مشہور قبیلۂ ہذیل کا مسکن تھیں۔ اس کے جنوب میں وادی القریٰ ہے۔ جس کے اطراف میں کنانہ کے قبیلے رہتے تھے۔ اس کی مختصر تاریخ یہ ہے:

روایات میں ہے۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام یا شیث علیہ السلام نے ابن بیت کی تعمیر کی۔ طوفان میں اس کی عمارت منہدم ہوگئی۔ اور ایک ٹیلہ سا رہ گیا۔ مگر لوگ اس کی تعظیم کرتے تھے۔ اور دعا مانگنے کے لئے وہاں آیا کرتے تھے۔ آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسکے بنانے کا حکم ہوا۔ انہوں نے وحی آسمانی کی ہدایت کے موافق اس کی عمارت بنائی۔ حدود حرم قائم کئے۔ عمارت بلندی میں ۹ گز تھی۔ اور اس کا دور حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز۔ رکن شامی سے رکن غربی تک ۲۲ گز۔ اور رکن غربی سے رکن یمانی تک ۳۱ گز۔ اور رکن یمانی سے رکن حجر اسود تک ۲۰ گز تھا۔ غرض اس وقت بیت اللہ کی شکل مستطیل تھی۔ اور اس کے دروازہ میں کواڑ بھی نہ تھے۔ اسعد تبع حمیری نے کواڑ۔ زنجیر۔ قفل بنائے اور پردہ چڑھایا۔ یہ عمارت ایک عرصہ تک قائم رہی۔ اور پھر منہدم ہوگئی۔ ابن ہشام لکھتے ہیں۔ جب حضرت اسمٰعیلؑ فوت ہوئے۔ تو ان کے بعد ان کے بیٹے ثابت اور بعد میں مضاض بن عمر جرہمی (ثابت کے نانا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے مضاض کی بیٹی سے شادی کی تھی) متولی بیت اللہ ہوا۔ لیکن سمیدع نامی ایک مدعی نے اس سے جنگ کی اور شکست کھائی۔ مضاض کے بعد اس کا بیٹا حارث۔ اس کے بعد حاکم۔ عمر بن حارث یعتصم بن ظلیم۔ حوش بن ححش بن مضاض۔ عداد بن صداد۔ فنحص بن عداد حارث یکے بعد دیگرے متولی ہوتے رہے۔ آخرکار جرہمیوں میں فسق و فجور پھیل گیا۔ اور ان پر بنی بکر و غشانی نے حملہ کردیا۔ اور جرہمیوں سے بیت اللہ خالی کرا لیا۔ جب جرہمی مغلوب ہوگئے۔ تو عمر بن مضاض بن حارث جرہمی نے حجر اسود کو زمزم میں پھینک دیا۔ اور پھر اُسے مٹی سے بھر دیا۔ اور

خود یمن چلا گیا۔ اس کے بعد عمر بن حارث غبشانی خزاعی متولی بیت اللہ ہوا۔ ایک مدت تک خزاعی یہ خدمت ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حلیل بن حُبشیہ خزاعی متولی ہوا۔ یہ لاولد تھا۔ اور اس کی لڑکی (حُبّیٰ) قصیؔ بن کلاب کے نکاح میں تھی۔ حلیل کے بعد قصی متولّی ہوا۔ اس وقت غوث بن مر بن اُد بن طابخہ بن الیاس بن مضر متولی اجازہ حج تھا۔ یعنے مناسک حج مثل قیام عرفہ و خروج عرفہ رمی و قیام منیٰ وغیرہ اس کی اجازت سے ادا کیا جاتے تھے۔ قصیؔ نے عہد تولیّت میں بنی کنانہ قضاعہ وغیرہ قبائل قریش کو مکہ میں جمع کر لیا۔ اور یہ دعوےٰ کیا۔ کہ بنی غوث (صوفہ) سے ہم امر حج میں اولیٰ ہیں۔ آخر لڑائی ہوئی۔ جس کا فیصلہ یعمر بن عوف بن کعب بن عامر بن لیث بن بکر بن عبد منات بن کنانہ نے اس طرح کیا۔ کہ خزاعی امر مکہ سے بالکلیہ بے دخل کردیئے گئے۔ اور تولّیت بیت۔ حجابہ۔ سقایہ۔ رفادہ (صلہ و عطا یعنے وہ رقم جو ساکنین حاجیوں کی امداد میں خرچ ہوتی ہے۔) ندوہ (قومی مجمع کی جگہ) اور لوا کا مختار عام قصیؔ کردیا۔ اس وقت قصیؔ نے پھر از سر نو کعبۃ اللہ کی تعمیر کی۔ اور پردہ چڑھایا[1]۔ اور قومی عصبیّت کی قوت سے بنو بکر و خزاعہ کو حدود حرم سے نکال دیا۔ اس اخراج کے بعد جرہمی تتر بتر ہو کر منقطع النسل ہوگئے۔ اور عرب میں قومی تذکروں کے سوائے ان کے وجود کے نام و نشان تک نہ رہا۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

کَاَنْ لَّمْ یَکُنْ بَیْنَ الْحَجُوْنِ اِلَی الصَّفَا[2]	اَنِیْسٌ وَّلَمْ یَسْمُرْ بِمَکَّۃَ سَامِرُ
بَلٰی نَحْنُ کُنَّا اَھْلَھَا فَاَبَادَنَا	صَرْفُ اللَّیَالِیْ وَالْخُطُوْبُ الْھَوَاجِیُ

[1] تاریخ میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد فتح مکہ بیت اللہ شریف پہ پردہ چڑھایا۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے قباطی پردہ چڑھایا۔ جو مصر میں بنا جاتا ہے پھر یہ ایک معمول ہوگیا۔ کہ ہر خلیفہ اپنے عہد خلافت میں نیا پردہ چڑھاتا تھا۔ مامون الرشید سال میں تین استعمال کرتا تھا۔ ایام حج میں دیبائے احمر کا رجب میں قباطی کا اور عید الفطر میں دیبائے سفید کا۔ پھر سلطان صالح نے مصر کے دو گاؤں مصارف پردہ پر وقف کردیئے۔ جب ترکی خاندان حکمران ہوا۔ تو سلطان سلیمان نے چند اور گاؤں اضافہ کردیئے۔ (از سیرت النعمانی)

[2] گویا حجون اور صفا کے درمیان کوئی آدمی نہ تھا۔ اور مکہ میں رات کو بیٹھ کر کسی نے باتیں ہی نہیں کیں۔ کیوں نہیں۔ ہم ہی تو وہاں کے ساکن تھے۔ ہم ہی کو گردش زمانہ اور حوادث عظیمہ نے تباہ کردیا۔

قصیٰ کے بعد عبدالدار اس کا بیٹا متولی ہوا۔ لیکن بعد میں بنی عبدالدار کے ساتھ بنی عبدمناف یعنے عبدشمس وہاشم ومطلب ونوفل امر تولیت میں مخالف ہوگئے۔ جس سے قریش کی دو ٹولیاں بن گئیں۔ یعنے بنو اسد بن عبدالعزیٰ بن قصیٰ اور بنو زہرہ بن کلاب اور بنو تیم بن مرّہ بن کعب و بنو حارث بن فہر بن مالک تو بنی عبدمناف کی طرف ہوگئے۔ اور بنو مخزوم بن یقظہ بن مرّہ و بنو سہم بن عمر بن ہصیص بن کعب اور بنو جمح بن عمر بن ہصیص و بنو عدی بن کعب وغیرہ بنی عبدوار کے ساتھ مل گئے۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد یہ قرار پایا۔ کہ سقادہ و رفادہ بنی عبدمناف کو دیا گیا۔ (یہ خدمت عبدشمس کو دی گئی) اور حجابہ ولوآ و ندوہ بدستور بنی عبدالدار کے تحت میں رہے۔ اور اسی دستور پر عہد جاہلیت کا خاتمہ ہوگیا۔

جب اسلامی دور شروع ہوا۔ تو اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہوا۔ ماكان من حلفٍ في جاهلية فان الاسلام لم يزده الا شدة۔ (کہ امر تولیت میں اسلام عہد قدیم کی ہی استحکامی چاہتا ہے) الغرض جب عبدشمس سقایہ و رفادہ کا مختار بن گیا۔ تو اس نے اس خدمت کو اپنے چھوٹے بھائی ہاشم کے سپرد کردیا۔ جب ہاشم غزہ ارض شام میں فوت ہوگیا۔ تو یہ خدمت مطلب (ہاشم کے چھوٹے بھائی) کے سپرد ہوئی۔

ہاشم بن عبدمناف نے ایام تولیت بیت اللہ میں مدینہ آکر سلمےٰ بن عمر بن عدی بن النجار سے نکاح کرلیا۔ (سلمےٰ پہلے اُحیحہ بن اطلاج کے تحت میں تھیں۔ اور اپنے شرف کے باعث کسی کو پسند نہیں کرتی تھیں)۔ ان سے عبدالمطّلب پیدا ہوئے۔ جب ہاشم غزہ میں فوت ہو گئے۔ اور عبدالمطلب مراہق (۸ سال) ہوئے۔ تو ان کے چچا مطلب انہیں لینے کے لئے مدینہ میں آئے۔ سلمی نے پہلے تو انکار کردیا۔ مگر پھر وہ راضی ہوگئیں۔ مطّلب ان کو اونٹنی پر اپنے پیچھے سوار کرکے مکہ لے آئے۔ ان کا اصلی نام شیبہ بن ہاشم ہے۔ لیکن جب لوگوں نے ان کو مطّلب کے پیچھے سوار دیکھا۔ تو اس گمان سے کہ شاید مطلب غلام خرید کر لائے ہیں۔ انہیں عبدالمطلب کے نام سے پکارا۔ ہرچند مطّلب نے اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہا۔ مگر ان کے لئے عبدالمطلب بن ہاشم ہی نام پڑگیا۔ اس کے بعد مطلب بردمان ارض یمن میں فوت ہوگئے۔

اور امر تولیت رفادہ و سقایہ عبدالمطلب بن ہاشم کی طرف منتقل ہوگئی۔ اس لئے کہ اس وقت تمام قریش میں ان سے بڑھ کر کوئی شخص اس خدمت کا اہل نہ تھا۔ عبدالمطلب سے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ پانچ بیبیاں تھیں۔ ابوطالب۔ زبیر۔ عبداللہ۔ ایک والدہ (فاطمہ بنت عمر بن عایذ) کے بطن سے ہیں۔

جب عبداللہ سترہ برس کے ہوئے۔ تو ان کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب رئیس بنی زہرہ سے ہوئی۔ عبداللہ تجارت کے لئے شام گئے۔ اور واپس آکر مدینہ میں انتقال کیا۔

روایت میں ہے۔ کہ عبدالمطلب کو بواسطۂ خواب تین مرتبہ بئیر زمزم کی ہدایت ہوئی۔ لیکن یہ کنوآں چونکہ ایک مدت سے اٹ کر گم ہوگیا تھا۔ اس لئے بظاہر اس کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس وقت اس کا حارث نامی ایک ہی لڑکا تھا۔ دونو باپ بیٹوں نے ملکر زمزم کی جگہ تلاش کرکے اسے کھودنا شروع کیا۔ جب اس کے آثار برآمد ہوگئے۔ تو دوسرے قریش بھی مدعی ہوگئے۔ کہ یہ ہمارے جدِّ اعلےٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا کنواں ہے۔ اس میں ہمارا بھی حق شرکت ہے۔ مگر عبدالمطلب نے ان کی بات نہ مانی۔ آخر فیصلہ کے لئے ہذیم کاہن بنی سعد حَکَم مقرر ہوا۔ یہ کاہن شام میں رہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ زمزم عبدالمطّلب کے لئے مخصوص کردیا گیا۔ انہیں دنوں میں پہاڑی پانی کی زد سے قصی بن کلاب کی بنائی ہوئی عمارت بیت اللہ میں چونکہ صدمہ پہنچ چکا تھا۔ قریش نے پھر اس کی تعمیر کی۔ اس وقت جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پچیس برس کی تھی۔ حضور صلعم بذاتِ خود بھی اس کام میں شریک تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے۔ کہ جب حجر اسود نصب کرنے کا وقت آیا۔ تو قریش میں باہم جھگڑا ہونے لگا۔ کہ اس کو کس قبیلے کے لوگ اٹھا کر نصب کریں۔ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں حَکَم مقرر ہوئے۔ اور یہ فیصلہ ہوا۔ کہ ایک چادر پر حجر اسود رکھا گیا۔ اور تمام قریش نے ملکر اس کو اٹھایا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اٹھاکر اس پتھر کو نصب کیا۔

قریش نے اس جدید تعمیر میں - کعبۃ اللہ کا طول بجائے بیس[۲] کے ۱۸ گز کر دیا - اور کچھ عرض میں بھی کمی کر دی - مگر دروازہ اس کا اتنا ہی اونچا رکھا - پھر زمانہ اسلام میں جب یزید بن معاویہ کی فوج معرکۂ کربلا سے واپس آ کر عبداللہ بن زبیر کے تعاقب میں کعبۃ اللہ پونچی - اور شہر کا محاصرہ کر کے پہاڑوں پر سے بذریعہ منجنیق پتھر اور آگ برسائی - تو اس سے کعبۃ اللہ کے پردوں میں آگ بھی لگ گئی - اور عمارت کی بنیادیں بھی بہت کچھ ہرج آ گیا - لیکن اسی دن یزید کے مرنے کی خبر آ گئی - اور فوج یزید واپس ہو گئی - پھر حضرت عبداللہ بن زبیر نے بیت اللہ کی از سرِ نو تعمیر کی - اور جو قریش نے کمی کی تھی - اس کو پھر انہوں نے پورا کر دیا یعنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدیم بنیاد پر عمارت بنائی - اور اس حدیث پر عمل کیا - جو حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے مروی ہے - کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - اگر تیری قوم کے لوگوں نے بہت قریب جاہلیت کا زمانہ نہ چھوڑا ہوتا - تو میں کعبۃ اللہ کو توڑ کر پھر بناتا - اور جس قدر زمین اس میں سے نکل گئی ہے - وہ پھر داخل کر لیتا - اور دروازہ اس کا زمین کے برابر رکھتا - اور دو دروازے بناتا - ایک شرقی - دوسرا غربی - اور بنیاد ابراہیم علیہ السّلام کو پورا کر دیتا - (بخاری)

یہ تعمیر جمادی الآخر سنہ ۶۴ ہجری میں شروع ہوئی - اور رجب سنہ ۶۵ھ میں تمام ہوئی - اس تعمیر میں ستونوں پر سونے کے پترے چڑھائے گئے تھے ؎

اس کے بعد سنہ ۷۲ ہجری میں عبدالملک خلیفہ مروانی کی طرف سے حجاج بن یوسف عامل مکہ نے پھر کعبۃ اللہ پر فوج کشی کی - سات مہینہ تک لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا - کہ جمادی الآخر سنہ ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ حاکم مکہ شہید ہو گئے - اور حجاج بیت اللہ پر قابض ہو گیا - اس نے عبداللہ کا نام مٹانے کے لئے سنہ ۷۴ھ میں کعبۃ اللہ کو گرا کر پھر بنایا - اور اس کی بنا قریش کی عمارت کے موافق قائم کی - (اس تعمیر میں عبدالملک مروانی کے حکم سے ۳۶ ہزار اشرفیاں خرچ کی گئی تھیں) ؎

جدید تعمیر بیت اللہ اس کے بعد ہارون الرشید نے پھر تعمیر بیت اللہ کا ارادہ کیا تھا - مگر امام مالکؒ نے سخت تاکید سے اس کو منع کیا - اور وہ رک گیا - پھر سلطان مراد چہارم نے (جو سنہ ۱۰۳۹ ہجری

تخت نشین ہوا تھا) - گوشہ حجرِ اسود کے سوائے تمام عمارت بیت اللہ کو گرا کر از سرِ نو تعمیر کی - اب تک وہی عمارت باقی ہے - مگر یہ عمارت حجاج اور قریش کی قدیم عمارت کے مطابق ہے - اس تعمیر میں چاہ زمزم پر بھی ایک عمارت بنائی گئی - جس پر لکھا ہوا ہے - وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا - اس عمارت کے فوقانی درجہ میں آجکل رئیس المؤذنین رہتا ہے - مطاف والی دائرہ نُون یعنی حد کے قریب ایک مدوّر دکہ (چبوترہ) ہے - جس پر ائمہ کے مصلّیات واقعہ ہیں - سب سے بڑا مصلّا حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا ہے - اس کے دو طبقے ہیں - یہ مصلّا کعبۃ اللہ کے رکنِ عراقی و شامی کے محاذی ہے - اس کی سیدھی جانب تھوڑے فاصلے پر امام مالک رضی اللہ عنہ کا مصلّا ہے - اور اس کی سیدھی جانب تھوڑے فاصلے پر امام احمد حنبل رضی اللہ عنہ کا اور مقام ابراہیمؑ کے قریب حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ کا مصلّا واقعہ ہے - اسی کے قریب مسجد حرام کا ممبر مبارک ہے - نماز جمعہ اسی مصلّے پر ہوتی ہے ؎

اس وقت مسجد الحرام کے تیئیس دروازے ہیں - باب[۱] ابراہیم - باب[۲] الوداع - باب[۳] حمیدی - باب[۴] النکیہ - باب[۵] العجاد - باب[۶] المجاہد - باب[۷] الصفا - باب[۸] البغلہ - باب[۹] المغوثس - باب[۱۰] العلی - باب[۱۱] العباس - باب[۱۲] النبیؐ - باب[۱۳] السلام - باب[۱۴] الدریبہ - باب[۱۵] سلیمانیہ - باب[۱۶] المحکمہ - باب[۱۷] الزیارہ - باب[۱۸] القبطی - باب[۱۹] البطہ - باب[۲۰] الرمالیہ - باب[۲۱] العتیق - باب[۲۲] العمرہ - باب[۲۳] دودیہ - قدیم الایام میں باب ابراہیم کو باب الخیاطین اور باب علی کو باب بنی ہاشم اور باب عمرہ کو باب بنی سہم کہتے تھے - (خلاصہ تواریخ)

مقام عادِ ارم - عادِ اُولیٰ

عادِ ارم و عادِ اولیٰ - نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد سب سے پہلی حکمران جماعت جو عرب میں ظاہر ہوئی - اس کا نام محاورۂ قرآن مجید میں عادِ اولیٰ ہے - اسی کو دوسری جگہ عادِ ارم سے موسوم کیا ہے - قولہٗ وانہ اھلک عَادًا الْاُوْلٰی وقولہٗ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ العماد (عاد بن عوض بن ارم بن سام بن نوح) اس کے وجود کا زمانہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح

ہے۔ لیکن حقیقی ترقی کا زمانہ دو ہزار دو سو برس قبل مسیح ہے۔ اور انتہا تقریباً ایک ہزار سات سو قبل مسیح۔ **عاد کا اصلی مسکن** عاد کا اصلی مسکن۔ احقاف یمن۔ حضرموت ہے۔ وسعت مملکت خلیج فارس سے حدود عراق تک تھی۔ بابل۔ شام۔ سینا انہیں کے زیر اقتدار تھے۔ مزاغنہ مصر بھی انہیں کی یادگار ہیں۔ شدّاد فاتح مصر اور سنان بن علوان پہلا فرعون مصر ہے۔ جس کے سامنے حضرت ابراہیم لائے گئے۔ اور اس نے آپؑ کی اہلیہ سے قربت کی خواہش ظاہر کی لیکن جب معاملہ منکشف ہو گیا۔ تو اس نے اپنی عزیزہ بیٹی ہاجرہ آنجناب علیہ السلام کی کنیزی میں دے دی۔ اس کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد حضرت یوسفؑ مصر تشریف لاتے ہیں۔ اور ایک عرصہ کے بعد ریّان بن الولید فرعون مصر ان کو اپنا نائب السلطنت مقرر کرتا ہے۔

عاد کی ترقی کا آفتاب جب ڈھلنے لگا۔ اور ان کے قدم شاہراہ صلاحیت سے ڈگمگانے لگے۔ تو ان میں حضرت ہود علیہ السلام پیدا ہوئے۔ قولہٗ "واذکر اخا عاد اذ انذر قومہ بالاحقاف"۔ لیکن ان کی آواز غیر مسموع ہوئی۔ آخر وہ دن آ گیا۔ کہ خداوند عالم نے اپنی زمین کی صلاحیت کے لئے ایک دوسری قوم کا انتخاب فرمایا۔ اور اس مفسد قوم کو احقاف کے باہر تلوار کے عذاب سے اور احقاف کے اندر ریگ رواں کے طوفان سے تباہ و برباد کر دیا۔

احقاف کا قطعہ احقاف۔ یمامہ۔ عمان۔ بحرین۔ حضرموت۔ اور مغربی یمن کے بیچ میں ایک عظیم الشان ریگستان ہے۔ جو سینکڑوں کوس تک وسیع ہے۔ اب اسے الربع زطالی کہتے ہیں۔ اس کے اندر بیشمار گاؤں اور بستیاں آباد تھیں۔ انہیں پر احقاف کا اطلاق ہوتا تھا۔ خصوص اس حصہ پر جو حضرموت سے نجران تک واقع ہے۔ اس میں جب تیز ہوا چلتی ہے۔ تو ریگ کے پہاڑ کے پہاڑ ہوا پر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں تھمتے ہیں۔ آناً فاناً ریگ کے پہاڑوں کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے گاؤں اس کے نیچے دب کر تودۂ خاک بنجاتے ہیں۔ روایات میں ہے۔ کہ ہود علیہ السلام قوم عاد پر عذاب نازل ہونے سے پہلے اپنی قوم کو لے کر احقاف سے حجاز چلے گئے تھے۔

عادِ ثانیہ۔ آیت میں ہے "نجّینا هودًا والذین آمنوا" (ہم نے ہود اور ان کے پیروؤں کو

عذاب سے بچا لیا) کہ حضرت ہودؑ اپنے متبعین کو ساتھ لیکر قوم عاد پر عذاب نازل ہونے سے پہلے احقاف سے نکل آئے تھے۔ مدین کے شمالی و مشرقی حصہ میں ان کی عظیم الشان عمارتوں کے آثارات پائے جاتے ہیں۔ عدنؔ کے قلعہ حصن الغراب میں بھی عاد ثانیہ کا آثار ملتے ہیں۔ ان کی ترقی کا زمانہ تقریباً سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اور انتہا ابتدائے عہدِ مسیح تک۔ لقمان حکیم اسی قوم کی یادگار ہے۔

قبر ہود علیہ السّلام حضرموت کے دامن کوہ وادی دوان میں حضرت ہود علیہ السلام کی قبر شریف ہے۔ جہاں کثرت سے لوگ زیارت کیلئے آتے ہیں۔

مقام ثمود

قرآن مجید میں عاد کے بعد ثمود کا ذکر ہے۔ "واذکروا اذ جعلکم خلفاء من عاد" (ثمود! یاد کرو کہ خدا نے تمکو عاد کے بعد جانشین بنایا) جس طرح عاد عرب جنوبی و مشرقی پر جو خلیج فارس کے ساتھ ساتھ حدود عراق تک وسیع ہے۔ حکمران تھے۔ اسی طرح اس کے بالمقابل عرب مغربی و شمالی پر ثمود قابض تھے۔ حجاز سے شام تک قدیم شاہراہ کے آس پاس **ثمود کی بستیاں** ان کی عظیم الشان عمارتوں کے نشان پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں چونکہ اس وادی میں جا بجا گاؤں اور شہر آباد تھے۔ لہٰذا اس وادی کو وادی القریٰ سے موسوم کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں ہے۔ "وثمود الذین جابوا الصخر بالواد" (ثمود جس نے وادی میں پتھروں کو کاٹا۔ یعنی پتھر تراش کر گھر بنائے) اس سے یہی وادی مُراد ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام ان کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ مگر قوم نے نافرمانی کی۔ آخر چند مومنین کے سوا تمام قوم برباد ہو گئی۔ زلزلہ و بجلی کی صورت میں ان پر عذاب نازل ہوا۔ حضرت صالح علیہ السلام ارفخشد بن سام بن نوح کے بیٹے اور ارم کے بھائی ہیں۔ اس قوم کی زندگی کا زمانہ تقریباً سنہ ۱۸۰۰ قبل مسیح سے سولہ سو (۱۶۰۰) قبل مسیح تک ہے۔ عہد موسےٰ علیہ السلام سے پہلے یہ قوم تباہ ہو چکی تھی۔ قوم ثمود کا مرکزی شہر الحجر تھا۔ جو اب حجاز ریلوے کا ایک اسٹیشن ہے۔

مدین

مدین ان چند آبادیوں کا نام ہے۔ جن کو مدین بن ابراہیم علیہ السلام نے یعنے ان کی قوم نے آباد کیا تھا۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ (عیلانہ) سے ساحل بحر احمر و ارض ثمود و حجاز تک واقعہ تھا۔ عہد یعقوب علیہ السلام سے عموماً مدین کی آبادیوں کا ذکر تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ لہذا تقریباً کہا جا سکتا ہے۔ کہ دو ہزار قبل مسیح میں مدین کی زمین آباد ہو چکی تھی۔ یوسف علیہ السلام کو چاہِ کنعان سے مصر لے جانے والا قافلہ مدیانی و اسمٰعیلی عرب ہی تھے۔ اس سے چار سو برس کے بعد حضرت موسےٰ علیہ السلام کا ظہور ہوتا ہے۔ اور مصر سے ہجرت کر کے اس سرزمین میں حضرت شعیبؑ کے ہاں وہ مہمان ہوتے ہیں۔ اور انہی کی ایک بیٹی سے نکاح کرتے ہیں۔ اس وقت یعنے سنہ ۱۶۰۰ قبل مسیح میں ارض مدین کے پانچ صوبے تھے۔ یا یہ کہ وہ پانچ بادشاہوں کے ماتحت تھا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ عوی۔ رقیم رضوء۔ حور۔ ربع۔ اس کے بعد جب حضرت موسےٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے۔ تو پھر انہوں نے مدین و موآب کے درمیان ہی اقامت فرمائی۔ لیکن اہل مدین چونکہ اس وقت فسق و فجور و اوہام پرستی و کفر و عصیان کے جملہ مراتب طے کر چکے تھے۔ اس لئے بنی اسرائیل کے ساتھ انہیں موافقت نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت موسےٰؑ نے بارہ ہزار لشکر کے ساتھ مدیانیوں اور ان کے معاونین سے جہاد کیا۔ مدین کے پانچوں سردار مارے گئے بیشمار مرد عورتیں اور بچے مقتول و قید ہوئے۔ بتیس ہزار کواری لڑکیاں قید ہوئیں؛

اس جنگ کے بعد حضرت موسیٰؑ کنعان کی طرف کوچ کر گئے۔ اور بنی اسرائیل کی ایک حکمران جماعت سرزمین مدین میں چھوڑ گئے؛

اس تباہی کے قریباً سو برس بعد عمالیق و اسمٰعیلی عرب مدین کی حمایت میں بنی اسرائیل پر ٹوٹ پڑے اور ایک مدت تک بنی اسرائیل کو اپنا جولانگاہ بناتے رہے۔ یہانتک کہ جدعون نامی ایک سردار بنی اسرائیل میں پیدا ہوا۔ جس نے ٹوٹی پھوٹی قوم کو سنبھالکر مدیانیوں سے سخت لڑائی کی۔ ایک لاکھ سے زیادہ مدیانی مارے گئے۔ عوریب و زیب نامی دو بادشاہ مقتول ہوئے۔

اور دو بادشاہ زباح و صلمناع پندرہ ہزار آدمیوں کے ساتھ فرار ہو گئے۔ بالآخر سنہ ۶۰۰ قبل مسیح میں بخت النصر نے عام اقوام عرب کے ساتھ بنی اسرائیل کا بھی فیصلہ کر دیا؛

لیکن حضرت شعیب اپنے خاندان و متبعین کو لے کر مدین سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اہلِ مدین کا زمانہ ثمود کے بعد کا ہے۔ لیکن مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھوں تباہ ہو گئے۔ تو پھر بقیہ ثمود نے اپنی آبائی جگہ سنبھال لی؛

ایکہ ایکہ (جنگل) اہل ایکہ کے پیغمبر بھی حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ یہ لوگ بنو ددان بن یقشان بن ابراہیم بطن قسطورہ سے ہیں۔ ان کا مسکن مدین اور خلیج عقبہ کے آس پاس تھا۔ ان کا نام بھی نافرمان قوموں میں ہے۔ بخت النصر نے ان کو تباہ کیا۔

رقیم مدین کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے۔ اسکا دوسرا نام سلاح اور پٹرا بھی ہے اصحاب کہف اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۷۰۰ قبل مسیح میں بنو ادوم (اولاد عیسو بن اسحاق) نے اس شہر کو اپنا دارالامارۃ قائم کیا۔ ان کے پادشاہ اول کا نام بالع بن باعور اور آخری بادشاہ کا نام ہدر رہے۔ توراۃ مقدس میں ان کے آٹھ بادشاہوں کے نام ہیں۔ سنہ ۱۳۰۰ قبل مسیح میں پہلے فراعنہ مصر اور طالوت اول بادشاہ بنی اسرائیل نے اُنپر حملہ کیا۔ اور پھر حضرت داؤد ثانی بادشاہ بنی اسرائیل نے ادوم کو فتح کر کے مملکت اسرائیلی میں منسلک کر دیا۔ پھر انہیں آزادی نصیب نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ بخت النصر نے اور اقوام کیساتھ انکا بھی خاتمہ کر دیا؛

مسکن ایوب حضرت ایوب علیہ السلام بن عوص بن دیسان بن عیسو بن اسحٰق بن ابراہیمؑ اسی ادومی قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ اور اسی قوم کے پیغمبر ہوئے۔ بُصرای نواح شام میں آپکا مسکن تھا۔

سبا وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ۔ میں سبا سے ایک سچی خبر لیکر آیا ہوں۔ سبا اصل میں یمنی قبائل عرب میں سے ایک قبیلے کا نام ہے۔ یہ در قبیلہ عبد شمس الملقب بہ سبا ہے۔ اس کے وجود کا زمانہ تاریخوں میں سنہ ۲۵۰۰ قبل مسیح سے پایا جاتا ہے۔ لیکن اسکی حقیقی ترقی کا دور سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح میں شروع ہو کر سنہ ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیری عربوں پر ختم ہوتا ہے۔ عام مؤرخین اور توراۃ مقدس سبا کی دولتمندی کثرت زر و جواہر فارغبالی اور عیاشی کے قائل ہیں۔ یمن کے علاوہ حبش اور شمالی عرب تک کی زمین انکے زیر اقتدار تھی تحقیق جدید سے سبا کے دور کے دو طبقے ہیں سنہ ۸۰۰

سے ۶۵۰ سنہ قبل مسیح تک میں شاہانِ سبا کا لقب مکارب ہے جسکے معنی مذہبی بادشاہ یا کاہن کے ہیں۔ ان مذہبی بادشاہوں کا دارالحکومت صرواح تھا۔ اسکے بعد ۱۱۵ سنہ قبل مسیح تک کے بادشاہوں کا لقب ملکِ سبا ہے۔ جنکا دارالخلافہ پہلے سلحین اور بعد میں شہر مآرب تھا؛

بلقیس، بلقمہ یا القمہ (آفتاب) دیبی کی مناسبت پر ایک شہزادی سبا کا نام یا لقب ہے۔ جو ۹۵۰ سنہ قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئی۔ اور داخل اسلام ہو کر حرماتِ سلیمانیہ میں داخل ہو گئی تھی؛

سیلِ عرم سد مآرب۔ انہی سبائی بادشاہوں کی یادگار ہے جس کا ذکر کلام مجید میں ہے۔ قولہ‘۔ فاعرضوا فارسلنا علیہم سیل العرم پھر انہوں (اہل سبا) نے نافرمانی کی۔ تو ہم نے ان پر بند کا (توڑ کر اسکا) سیلاب بھیجا یمنی زبان میں پانی کے بند کو عَرِم اور حجازی میں ملکہ کہتے ہیں۔ شہر مآرب کے دائیں بائیں دو پہاڑ ہیں جنکا نام ابلق ہے۔ ان پہاڑوں کا بارشی پانی وادی اُذینہ میں دریا کیطرح جاری ہوتا ہے۔ شاہانِ سبا نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ سنہ قبل مسیح میں سد مآرب کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند یکسو پچاس ہاتھ چوڑا ستره ہاتھ اونچا ہے۔ اور ۳۵۰ ہاتھ کے قریب لمبا تھا یشرح امرتین نامی شاہِ سبا نے اسکی تعمیر شروع کی لیکن پوری تعمیر مختلف شاہانِ سبا کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اس سد میں نیچے اوپر کئی کھڑکیاں اور پانی تقسیم ہونے کے دروازے تھے۔ اس نظام آبرسانی سے ۳۰۰ کوس میں ریگستان نمونہ بہشت بنا ہوا تھا جسمیں انواع و اقسام کے میوے اور بیشمار خوشبودار درخت تھے۔ اب اسکا اکثر حصہ تو افتادہ ہے۔ البتہ ایک ثلث دیوار باقی ہے۔ اسلام سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے بند کے ٹوٹ جانے کے باعث اہل سبا کے باغات وغیرہ تباہ ہو چکے تھے؛

قومِ تُبّع کے مسکن تُبّع حمیری زبان میں تُبّع بمعنے جبار و قہار کے ہے۔ سبا کے بعد حمیر نے ۵۵۰ برس تک یمن پر حکمرانی کی ہے۔ پھر تبابعہ نے تمام ملک یمن پر قبضہ کر لیا۔ اس دور کی ابتدا تقریباً تیسری صدی عیسوی یا اوائل چوتھی صدی سے شروع ہو کر ۵۲۵ سنہ عیسوی پر ختم ہوتی ہے؛

مؤلف ارض القرآن بحث مملکت حمیر کے ضمن میں لکھتے ہیں حمیر کا دوسرا طبقہ تیسری صدی عیسوی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے اور ابھی چند ہی بادشاہ گذرتے ہیں۔ کہ اکسومی حبشی چوتھی صدی کے اوسط میں یمن میں گھس آتے ہیں۔ چند سال بعد حمیر ان حبشیوں کو ملک سے نکالکر پھر وطنی حکومت قائم کرتے ہیں

یہ طبقہ ۵۲۵ء تک جبکہ آخر بار اہل حبش فاتحانہ یمن میں داخل ہوتے ہیں۔ قائم رہتا ہے۔ انہی تواریخ میں تُبّع اول کا نام الحارث الرائش ہے۔ اور تُبّع کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے۔ کہ پہلے یمن اور حضرموت میں دو بادشاہ علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔ ان میں ایک قبیلہ دوسرے کا ماتحت نہیں ہوتا تھا لیکن حارث الرائش کی بادشاہی پر دونوں قومیں متفق ہو گئیں۔ اور اُسکی تبعیت اختیار کر لی۔ اسلئے وہ بادشاہ تُبّع کے لقب سے پکارا گیا۔ اور واضح ہو۔ کہ تبابعہ حمیر سے کوئی علیحدہ قوم نہیں ہے۔ بلکہ انہیں حمیری بادشاہوں میں سے بعض کا لقب تبابعہ ہے؛

تبابعہ کی حکومت تمام یمن۔ تہامہ نجد تک وسیع تھی۔ آخر ۵۲۵ء میں آخری حمیری بادشاہ ذونواس اکسومی حبشیوں سے شکست کھاتا ہے۔ اور تقریباً چالیس برس بعد ایرانی آتے ہیں۔ اور

اہل یمن کا قدیم مذہب اس سے چند ہی سال بعد تہامہ کی گھاٹیاں نورِ اسلام سے چمک اٹھتی ہیں۔ اسلام سے پہلے اس ملک کے لوگ اکثر یہودی، کچھ ستارہ پرست تھے۔ صرف اہل نجران نے عیسویت اختیار کی ہوئی تھی؛

ہجرت گاہِ صحابہ نجاشی شاہانِ حبش کے بادشاہوں کا لقب ہے۔ ان کا پایہ تخت شہر اکسوم ملک حبش کے صوبہ تجرے میں واقعہ ہے۔ نجاشی جس کے ملک میں صحابہ کرام نے ہجرت کی۔ نیز جس نے اسلام قبول کیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ جسکے جنازہ کی نماز پڑھی۔ وہ اسی خاندان اسی ملک اور اسی شہر کا حاکم تھا؛

اصحابِ فیل عیسائی اکسومی حبشیوں میں سے ابرہہ نامی ایک بادشاہ ہوا ہے ۵۴۳ء میں اس کے دل میں کعبۃ اللہ کی تخریب کا خیال اُٹھا۔ پہلے اس نے یمن کے تمام شہروں میں کلیسے تعمیر کروائے۔ اور سب سے بڑا کلیسا (القلیس) یمن کی دارالحکومت شہر صنعا میں بنوایا۔ ۵۷۰ء میں اس نے مکہ پر فوجکشی کی جسکی پاداش میں خداوند عالم کا غضب ایک خاص عذاب کی صورت میں اس پر نازل ہوا۔ اور لشکر سمیت اسے تباہ کر ڈالا۔ اس مہم کو وقعۃ الفیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس سال کو عام الفیل کہتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک اسی سال میں اس واقعہ کے چالیس روز بعد ہوئی ہے۔ سورۃ الفیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ سورہ اس واقعہ سے تقریباً پچاس برس بعد نازل ہوئی ہے؛

اصحاب الاخدود نجران، بنی اسمٰعیل میں سے بجیلہ بن نزار کا آباد کیا ہوا شہر ہے بلادِ احقاف و عسیر میں ایک مختصری

آبادی ہے۔ اسلام سے پہلے روم وحبش کی کوششوں سے یہاں عیسویت پھیل گئی تھی۔ یمن کی یہودی سلطنتیں ان سے ہمیشہ برسرِ خصومت رہتی تھیں۔ اس میں ایک عالیشان کنبہ تھا جو کعبۂ نجران کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہاں کے راہب طرح طرح کے حیلوں سے عیسویت کے پھیلانے میں مشغول رہتے تھے۔ تاریخ میں ہے۔ کہ ایک نجرانی راہب سرِ راہ جنگل میں رہتا تھا۔ اور آنے جانے والوں کو عیسویت کی ہدایت کرتا تھا۔ جب اس کا عام چرچا ہو گیا۔ تو ذونواس حمیری تبع شاہ یمن (جو یہودی المسلک تھا) نجران پر فوج لے کر چڑھ آیا۔ شہر کا محاصرہ کر کے اطراف شہر میں خندقیں کھدوادیں اور ان میں خوب آگ دھکائی۔ پھر ایک ایک عیسائی کو شہر میں سے لایا جاتا۔ جس نے یہودیت سے انکار کیا اسے آگ میں دھکیل دیا جاتا۔ قرآن مجید میں اصحابُ الاُخدُود سے انہیں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حجر مدینہ منوّرہ سے آگے شمال کی جانب جوف اور وادی القری کے نام سے ایک میدان آتا ہے۔ جہاں ثمود کا قبیلہ آباد تھا۔ شہر حجر انہیں آبادیوں کا دار الحکومت تھا۔ جو بعد میں اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے نام سے مدائن صالح سے موسوم ہوا۔ سنہ ۹ھ میں تبوک جاتے وقت، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شہر پر گذر ہوا تھا۔ اب یہ شہر حجاز ریلوے کا ایک سٹیشن ہے اور اس سے تیسرا اسٹیشن تبوک ہے۔

اصحاب الحجر اصحاب الحجر عام مفسرین اصحابُ الحجر سے اہل ثمود مراد لیتے ہیں۔ جن کا دار الخلافہ وادی القری کے مشہور شہر حجر میں تھا۔ لیکن مؤلف ارض القرآن لکھتے ہیں۔

اصحاب حجر سے مراد ثابت بن اسمٰعیل کی اولاد ہے۔ جو سنہ ۷ سات سو قبل مسیح میں حجاز سے عراق اور شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ اولادِ ثابت یا انباط کا ملک تین ممالک قدیمہ کا مجموعہ تھا۔ ملک ثمود (جوف و وادیِ القری جس کا دار الحکومت شہر حجر تھا) ملک مدین جس کا مرکزی شہر خود مدین ہی تھا۔ اور ملک ادوم جس کا پایہ تخت شہر رقیم تھا۔ انباط کا دار الخلافہ پہلے شہر رقیم قائم ہوا۔ سنہ ۳۱۲ قبل مسیح میں رومیوں نے وہ ملک ان سے چھین لیا۔ پھر انباط نے اپنا مرکز شہر حجر قرار دیا۔ سنہ ۹ قبل مسیح میں حضرت یحییٰ بن زکریا اس قوم کیلئے پیغمبر مبعوث ہوئے۔ جن کو ایک فاسق بادشاہ حادث رابع قبطی نے شہید کر ڈالا۔ اس واقعہ کے بعد قبطی سلطنت پر رومیوں نے قبضہ کر لیا۔ اور قبطی تتر بتر ہو کر رومیوں اور

شامیوں کی ماتحتی میں زندگی بسر کرتے رہے۔

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ۔ سنہ ۶۱۰ عیسوی سے ایرانی بادشاہ شام وروم کی طرف بڑھنے لگے۔ خسرو پرویز نے لگاتار پندرہ سال میں متواتر حملوں سے وادی نیل اور ساحل باسفورس تک ہر جگہ خاک اڑادی۔ عرب وشام کی درمیانی غسانی حکومت بھی تباہ کر دی۔ آخر رومیوں سے آرمینیہ۔ شام۔ بصرےٰ تمام مشرقی حصہ نکل گیا۔ قسطنطنیہ محصور ہو گیا۔ ہرقل قیصر روم بھی فرار پر مجبور ہو گیا۔ کہ سورۂ روم میں زیرِ آیت الٓمٓ غلبت ... الخ میں اہل روم کو دوبارہ فتحیابی کی خوشخبری سنائی گئی۔ جو بلفظہٖ پوری ہوئی دفعۃً ہوا کا رُخ پلٹ گیا۔ ایرانیوں کے قدم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک سنہ ۶۱۶ء سے سنہ ۶۲۴ء تک رومیوں نے تمام اپنے شہر ایرانیوں سے واپس لے لئے اس وقت غسّانی عربوں میں حارث بن ابی شمر رئیس غسّان تھا۔ سنہ ۶۲۹ء یا سنہ ۸ھ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم ہرقل کے ہاں حضرت دحیہ کلبی اور جبلہ بن ایہم غسّانی امیر کے ہاں شجاع بن وہب کے ذریعہ دعوت اسلام بھیجی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور اسلام کے برخلاف مدینہ منوّرہ پر فوجکشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جس سے سنہ ۸ھ یا سنہ ۶۳۰ء رسول کریم صلعم نے تین ہزار صحابہ کی جمعیت حدود شام پر روانہ فرمائی۔ ادہر سے رومی لشکر بھی آ رہا تھا۔ بمقام موتہ تصادم ہوا۔ اور ایک غیر منفصل لڑائی کے بعد مسلمان مدینہ میں واپس ہو گئے۔ سنہ ۹ھ میں دوبارہ ہرقل نے غسّان ولخم وجذام۔ عاملہ قبائل عرب کو مسلمانوں کے برخلاف لڑائی پر ابھارا۔ ادہر سے اسلامی تین ہزار لشکر روانہ ہوا۔ مقام تبوک پر پہنچکر انتظاری کی گئی مگر لڑائی نہ ہوئی۔ بیس دن کے بعد اہل حوران سے معاہدہ صلح کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مراجعت فرمائی۔

مدینہ منوّرہ (مدینۃ النبی طیبہ قدیم نام یثرب)

تقریباً سنہ بیس ہزار قبل مسیح میں یثرب بن وائل (مہلائیل) بن ارم بن سام بن نوح نے اس شہر کو اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ حدیث شریف میں مدینہ کو یثرب سے موسوم کرنے کی ممانعت آئی ہے

اس لئے کہ یثرب کا لفظ ثرب (بمعنے فسق و فساد) پر مشتمل ہے۔ اور یا تثریب بمعنے توبیخ سے ماخوذ ہونے پر اشتباہ پیدا ہوتا ہے؛

تاریخ میں ہے۔ کہ واقعہ سیل عرم سے پہلے تقریباً سنہ ۹۰۰ قبل مسیح میں عمران بن عامر رئیس قوم سبا نے خواب میں دیکھا یا کاہن سے سُنا۔ کہ مآرب کا بندِ آب ٹوٹ کر قوم سبا کی بستیاں اور انکی آبادی تباہ و برباد کر دیگا۔ اس لئے وہ مارب سے نکل پڑا۔ اور اپنے عیال کو لے کر عمّان میں قیام پذیر ہوگیا۔ اور اس کا بھتیجا ثعلبۃ العنقاء بن عمر بن عامر ماء السماء معہ اہل و عیال حجاز میں ثعلبہ و ذیقار کے درمیان آ ٹھہرا۔ ان دنوں حجاز کے مالک بنی اسرائیل بنے ہوئے تھے۔ اسرائیلیوں سے لڑتا جھگڑتا مدینہ آ پہنچا۔ یہاں متفرق طور پر یہود آباد تھے۔

مدینہ منورہ ان سے بھی لڑائی کر کے مدینہ خالی کرالیا۔ اور اطراف کے یہودی و اسرائیلی قلعوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور مدینہ کو گڑھیوں اور چھوٹے چھوٹے قلعوں سے محفوظ بنا کر ایک خود مختار رئیس بن بیٹھا۔ ثعلبہ سے حارثہ اور اس سے اوس و خزرج پیدا ہوئے۔ تمام انصار مدینہ انہی دو بھائیوں کی اولاد ہیں۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی۔ تو اس مبارک شہر میں قیام فرمایا۔ وہیں مسجد نبوی بنوائی۔ اور رہنے سہنے کے لئے مکان تعمیر کروائے۔ اوس و خزرج نے معاونت کی جس سے ان کا نام انصار مشہور ہوا۔ اسی شہر میں آپؐ کا وصال ہوا۔ وہیں مزار مبارک ہے۔ احادیث میں اس مبارک بلدہ کے کثرت سے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ امام مالکؒ نے اس کو مکّہ مکرمہ پر بھی ترجیح دی ہے۔ اور بسندِ صحیح رافع بن خدیج سے روایت بیان کی ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "المدینۃ خیرٌ مِّن مکّۃ" کو مدینہ مکّہ سے افضل ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ و امام شافعیؒ کو اس میں اختلاف ہے؛

بدر مدینہ منوّرہ کے قریب ایک قریہ ہے۔ جسکو قبیلہ جہینہ کے بدر نامی ایک شخص نے آباد کیا تھا۔ سنہ ۲ھ میں اس مقام پر کفار مکّہ سے لڑائی ہوئی۔ اس معرکہ میں ۳۱۵ صحابی مردِ میدان تھے۔ سامانِ جنگ میں تین گھوڑے۔ سات اونٹ اور آٹھ تلواریں تھیں۔ اور خوراک کی مقدار بھی بہت کم تھی۔ اور لشکر کفّار میں ایکہزار مسلّح جوان سو گھوڑے ستّر اونٹ تھے۔ خوراک کافی تھی۔ اور ایک جماعت مغنیّہ عورتوں کی بھی ساتھ تھی؛

اُحد بضم ہمزہ ایک پہاڑ کا نام ہے۔ مدینہ منوّرہ سے شمال کی طرف تین میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے۔ سنہ ۳ھ میں اس جگہ کفار مکّہ کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔ جس میں دندان و لب مبارک آنحضرت علیہ السّلام شہید و زخمی ہوئے۔ پیشانی مبارک پر بھی زخم آگیا تھا۔ صحابہؓ کی ایک کثیر جماعت شہید ہوئی۔ اسلامی لشکر کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ اس میں ایک سو زرہ پوش تھے۔ اور تین علم تھے۔ (۱) لوائے مہاجرین مصعب بن عمیر کے ہاتھ میں تھا۔ (۲) لوائے انصار اوس سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں اور لوائے انصار خزرج کے حامل حباب بن المنذر تھے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین؛

اور لشکر کفار میں تین ہزار مسلّح جوان۔ سات سو زرہ پوش۔ دو سو گھوڑے۔ تین ہزار اونٹ اور پندرہ زنانہ ہودج تھے۔ جن میں اکثر مرثیہ خواں عورتیں تھیں۔ جو کشتگانِ بدر پر نوحہ کر کے کفّار کو انتقام کے لئے ابھارتی تھیں۔ شمار میں یہ اٹھارویں لڑائی ہے؛

حنین حنین۔ طائف کے قریب ایک قریہ ہے۔ سنہ ۸ھ میں اس مقام پر لڑائی ہوئی۔ اسلامی لشکر بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) کے قریب تھا۔

جمع جمع۔ مزدلفہ کو کہتے ہیں۔ (منیٰ و عرفات کے درمیان ایک مقام ہے)

مشعر الحرام مشعر الحرام۔ مزدلفہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے؛

نقع نقع۔ مزدلفہ و عرفات کی درمیانی جگہ؛

مصر مصر و بابل۔ یہ دونو قدیم شہر ہیں۔ مصر۔ نوح علیہ السلام کے پوتے مصرائم بن حام کی یادگار ہے۔ اور بابل نمرود بن کوش بن حام بن نوح کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ سنہ ۲۲۰۰ قبل مسیح کے آثار میں ان شہروں کے نام پائے جاتے ہیں؛

الصفا الصفا۔ مکّہ مکرمہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ اب سیڑھیوں کی شکل میں ہے۔ اس کی چودہ سیڑھیاں ہیں۔ اور تین کمانیں ایک چبوترہ ہے؛

مروہ یہ بھی ایک چھوٹی سی پہاڑی کا نام ہے۔ صفا کے بالمقابل واقعہ ہے اس کی پانچ سیڑھیاں اور ایک کمان ہے۔ یہ دونو پہاڑیاں حرم کعبۃ اللہ کے بالکل نزدیک ہیں۔ صفا سے مروہ کی طرف جب جاتے ہیں۔ تو پہلے ۹۳ قدم کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا پتھر کا

ستون ملتا ہے - اور اس سے ۷۵ قدم کے فاصلہ پر دوسرا ستون ہے - یہ دونو میل مسافت
رمل کی علامت ہیں - ان دونو ستونوں کو خلیفہ المستقی بامر اللہ نے ۵۲۵ ہجری میں تعمیر
کروایا تھا - ان میلوں سے آگے ۳۲۵ قدم کے فاصلہ پر مقام مروہ ہے - جاہلیت میں کوہ
صفا پر اساف نامی مرد کی صورت میں ایک بُت بنا ہوا تھا - اور مروہ پر نائلہ نامی عورت
کی صورت میں بُت تھا - دراصل یہ دونو جرہمی قوم کے عورت و مرد ہیں - انہوں نے کعبۃ اللہ
کے اندر زنا کیا تھا - جس پر قوم نے ان دونو کی صورت کے بُت بنا کر کھڑے کر دیئے تھے - تاکہ
لوگ عبرت پکڑیں - اور اُن پر لعنت بھیجیں - او رنفریں کریں - لیکن بعد میں جب بُت پرستی کا
رواج عام ہو گیا - تو یہ بت بھی معبود بن گئے - اور قابل پرستش مان لئے گئے ؛

مسجد اقصےٰ بیت المقدس مسجد اقصے - بیت المقدس صابئیوں کے زمانہ میں اس کی جگہ پھلواری تھی -
بیچ میں ایک پتھر رکھا ہوا تھا - جس پر منتوں کا تیل چڑھایا جاتا تھا - اس
کے بعد انہوں نے وہاں پر ایک ہیکل (مندر) بنوایا - جب بنی اسرائیل غالب ہوئے - تو
انہوں نے اس مقام پر اس پتھر کو اپنا قبلہ قایم کر لیا - اس کی شرح یہ ہے - کہ حضرت موسےٰ
علیہ السلام بنی اسرائیل کو جب مصر سے لیکر بیت المقدس کی طرف چلے - (جیسا کہ اللہ تعالےٰ
نے ان کے دادا اسحاق سے وعدہ فرمایا تھا) اور تیہہ کی زمین میں آکر ٹھہرے - تو بذریعہ وحی
انہیں سبط کی لکڑی کا ایک خاص صورت پر قبہ تیار کرنے کا حکم ہوا - (اس کی تفصیل توراۃ
مقدس میں ہے) اور یہ کہ تابوت و مائدہ و صحاف (پیالے) و چراغدان معہ قنادیل سب
اس قبہ میں رکھ کر صابئیوں کے پتھر پر رکھدیا جائے - اور ایک مذبح بھی صفات خاص سے
متصف قربانی کے لئے بنایا جاوے - حضرت موسےٰ علیہ السلام نے فرمان وحی کے مطابق
قبہ بنایا - اور اس میں تابوت رکھدیا - اس تابوت میں وہ الواح بھی تھیں - جن پر احکام
عشرہ لکھے ہوئے تھے - (لیکن یہ وہ منزّلہ لوحیں نہیں تھیں - کیونکہ وہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکی
تھیں) یہ مصنوعہ لوحیں منزّلہ لوحوں کے بدلے تیار کرائی گئی تھیں - اور ہارون علیہ السلام اس
کے متولی قرار پائے - تابوت اس قبہ کے بیچوں بیچ رکھا ہوا تھا - اور بنی اسرائیل اس کے گرد
طواف کرتے تھے - اور اس کی طرف رُخ کر کے عبادت کیا کرتے تھے - اس کے سامنے قربانی کی

جگہ بنی ہوئی تھی "

مسجد کی بنیاد ڈالی گئی جب یہود بیت المقدس پر قابض ہوئے - تو انہوں نے اس قبہ کو صابئی
فرقہ کے پتھر مذکور پر رکھدیا اور اسے قبلہ عبادت بنا لیا - اس کے بعد جب داؤد علیہ السلام کا
زمانہ آیا - تو انہوں نے اس پتھر پر مسجد کی بنیاد رکھی - مگر جلدی فوت ہو گئے - پھر سلیمان
علیہ السلام نے چار برس کی لگا تار کوشش سے اس کی تعمیر کی - اس وقت حضرت
موسےٰ علیہ السلام کی وفات پر پانسو برس گذر چکے تھے - اس مسجد سلیمانی کے ستون

سلیمانی مسجد تعمیر ہو گئی پیتل کے اور چھت شیشے کی تھی - در و دیوار اور محراب
وغیرہ سونے سے مرصّع تھے - ہیکل - صورتیں - چراغدان - زنجیر - منارے - کنجیاں -
سب سونے کی تھیں - اس میں ایک قبر صندوق یعنے تابوت رکھنے کے لئے بنوائی جسکو
صبیحوں سے اس کے دادا بزرگوار لے آئے تھے - آٹھ سو برس تک تمام چیزیں اسیطرح رکھی رہیں

مسجد گرا دی گئی یہاں تک کہ بخت النصر نے اس پر حملہ کیا - اور ویران و تباہ کر ڈالا - توراہ
عصا - ہیکل سب کو جلا دیا - مسجد کی عمارت گرا دی - یہودیوں کو قید کر کے غلام بنا لیا -
مدت مدید کے بعد شاہان فارس کی امداد سے یہودیوں کو رہائی ملی - اور وہ بیت المقدس
کو واپس آئے - پھر انہوں نے حضرت عزرا (عزیر) علیہ السلام کی زیر اطاعت ہو کر بہمن شاہ

پھر مسجد بنائی پارسی کی مدد سے پھر مسجد بنائی - مگر یہ مسجد سلیمانی مسجد سے کسی قدر
چھوٹی تھی - اس کے بعد یونانی - پارسی - رومانیہ - سلاطین کا اپنی اپنی باری میں دَور دَورہ
رہا - اس کے بعد پھر یہودی دمشق پہ غالب آگئے - اور کچھ مدت اس کی حکومت بنی
حسنائی کا نہان بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہی - پھر اس کی قرابت کی وجہ سے ہیرودڈس

مسجد از سر نو تعمیر ہوئی کو پہونچی - اس نے اپنے عہد میں پھر از سرِ نو مسجد کی تعمیر کرائی
اور سلیمانی بنا پر اس کی عمارت قائم کی - چھ برس کی لگا تار کوشش سے نہایت عالیشان
عمارت نقش و نگار سے مرصّع ہو کر تیار ہو گئی - پھر اولاد ہیرودڈس پر طیطش شاہ روما

مسجد گرا دی گئی نے غلبہ پا کر مسجد کی تمام عمارت خراب کر دی - اور اس کی اینٹ سے
اینٹ کو جدا کر کے ایک ویران کھنڈر بنا دیا - اور وہاں ہل چلا کر زراعت کا حکم دیدیا

ایک مدت تک وہاں کھیتی باڑی ہوتی رہی - یہاں تک کہ قسطنطنین اعظم تخت نشین ہوا - اور اس کی والدہ ہیلانہ نے عیسویت اختیار کی - اور وہ زیارت بیت المقدس کے لیئے دمشق آئی - اس نے وہاں پہونچکر پہلے اس لکڑی کو تلاش کرایا - جس پر بزعم عیسائیاں حضرت مسیحؑ مصلوب ہوئے تھے - اور وہ صلیب کوڑے میں دبی پڑی تھی - بہزار دقت برآمد ہوئی - قسیسوں کے خیال میں چونکہ حضرت مسیحؑ مصلوب اس لکڑی (صلیب) سمیت اس جگہ پھینکے گئے تھے - لہذا ہیلانہ نے اس کوڑے کرکٹ کی جگہ گرجا بنوادیا - جو کلیسائے قمامہ کے نام سے موسوم ہوا - گویا یہ گرجا عین قبر مسیح علیہ السّلام پر بنوایا گیا ہے - اس کے بعد ہیلانہ نے بیت المقدّس خراب شدہ کو تلاش کرکے اسکی بنیاد تک کے پتھر نکلوا ڈالے - اور بزعم خود اسے بالکل ملیامیٹ کردیا - اور پتھروں پر بھی کوڑا کرکٹ پھینکوادیا - اور اس بڑے پتھر کو بھی کوڑے میں ڈھکوادیا - اس کے بعد عیسائیوں نے کنیسہ کے مقابل بیت اللحم کی بنیاد ڈالی - یہ وہ مقام ہے - جہاں حضرت عیسےٰ علیہ السّلام تولّد ہوئے ہیں - زمانہ اسلام تک یہی حالت رہی - اسلامی دور میں جب بیت المقدس اور تمام شام کا ملک فتح ہوا - تو خلیفۂ وقت حضرت

عمر بن الخطابؓ نے مسجد کی تعمیر کی

عمر بن الخطاب نے بذاتِ خود بہزار دقّت اس پتھر کو تلاش کیا - اور اس پر ایک مسجد بنوائی - پھر ولید نے اپنے عہدِ حکومت میں شاہ روم سے سامان عمارت و معمار منگوا کر اسے ایک عالیشان مسجد بنا دیا - اس کے بعد ۵۰۰ھ میں جب خلافت کو ضعف پہونچا - تو عیسائیوں نے پھر شام پر قبضہ کرلیا - اور سنگِ

مسجد گرادی گئی

مقدّس پر بجائے مسجد کے ایک عالیشان گرجا تعمیر کرادیا - لیکن بعد میں فوراً ہی سلطان صلاح الدین نے مصر و شام پر استیلا پالیا - اس نے پہلے عبیدیوں کے آثار مٹائے - اور پھر نصاریٰ کو شکست پر شکست دیکر شام سے نکالدیا - اور پتھر مقدّس پر سے گرجا منہدم کراکر اس پر پھر از سرِ نو مسجد بنوائی - جو اس وقت تک موجود ہے - بیت المقدس کی باربار تخریب اور حکومتوں کے انقلابوں کے ساتھ بائبل مقدّس (عہد عتیق کی اڑتیس کتابیں اور عہد جدید کی نو کتابیں) پر بھی تباہی آتی رہی - کبھی انہیں

چارلس ڈالمین صاحب

پھینکوادیا گیا - کبھی جلادیا گیا - کبھی اس میں تغیّر و تبدل و تحریف کردی گئی - چنانچہ چارلس ڈالمین صاحب لکھتے ہیں - گذشتہ زمانہ میں کتابوں کا لکھنا اور حفاظت سے رکھنا ایک مشکل کام تھا - کیونکہ اول تو کاغذ ہی نہ تھے - جب کاغذ ایجاد ہوئے - تو پہلے ایک طرف لکھنے کا طریق قائم ہوا - اور لکھے ہوئے کاغذ پولندہ بنا کر رکھے جاتے تھے - جن کے کھولنے کے لیئے بڑی جگہ درکار ہوتی تھی - نیز اس زمانہ میں کتابوں میں بالارادہ یا اور کسی سبب سے تغیّر و تبدّل کا ہوجانا نہایت آسان تھا ملحدوں کا خیال کرتے ہوئے اس قسم کی خرابیوں کی بائبل میں بہت زیادہ قابلیّت تھی۔

بخت النصر کے وقت جب یہود پر تباہی آئی - لاکھوں مقتول اور ہزاروں قید ہوئے - اس وقت تمام نسخے عہد عتیق کے برباد کردیئے گئے - یہاں تک کہ اگر عزرا نہ پیدا ہوتا - جنہوں نے ان تمام کتابوں کو پھر لکھ کر مرتّب کیا - تو آسمانی کتب مقدسہ کا وجود اور ان کا نشان تک بھی نہ ملتا - لیکن عزرا کے بعد ہی شہنشاہ اینٹوکس نے بیت المقدّس کو فتح کرلیا - اور یہودیوں کا قتل عام شروع کردیا - عہد عتیق کے جس قدر نسخے اس کو مل سکے - جلوادیئے - اور اعلان عام کردیا - کہ جس کے پاس عہد عتیق کا کوئی نسخہ یا کتاب نکلے گی - یا وہ مذہبی رسوم ادا کرے گا - قتل کردیا جائیگا - چنانچہ اس کی تصریح خود کتاب مقدس مقابیس اوّل کے پہلے باب میں ہے - انتہی

ڈاکٹر ملز

ڈاکٹر ملز لکھتے ہیں - یہ امر مسلم ہے - کہ عہد عتیق کے تمام نسخے یروشلیم اور ہیکل کے ساتھ بخت النصر کے لشکر کے ہاتھوں برباد ہوگئے - اور عزرا کے نسخوں کی نقلیں بھی حادثۂ انٹیوکس میں ضائع ہوگئیں - اور ان کتابوں کی صداقت کی کوئی گواہی نہ تھی - جبتک کہ مسیحؑ اور ان کے حواریوں نے بشارت نہ دی۔

ایک محقق

ایک محقّق لکھتے ہیں - عہد حوارین سے پندرہویں صدی تک تمام کلیسوں میں بائبل کا یونانی ترجمہ مستعمل تھا - اصل نسخہ عبری جو یہود کے پاس تھا - اس کی طرف جمہور سلف ملتفت نہ تھے - یہود نے اس میں بہت سے تصرّفات کرڈالے - اور دسویں صدی میں ایک مجلس منعقد کرکے تمام کتاب مقدّس کے نسخوں کو غلطی اور تحریف کا الزام لگا کر جلا دینے کا

حکم دے دیا۔ اس حکم کے مطابق تمام نسخے کتاب مقدس کے جلادیئے گئے۔ اٹھارہویں صدی میں جب مسیحی علماء کتاب مقدس کی تصحیح اور مقابلہ کے لئے مستعد ہوئے۔ تو ان کو کوئی پورا نسخہ عبرانی کا ایسا نہ ملا۔ جو دسویں صدی سے پہلے کا لکھا ہوا ہو۔

ہارن صاحب ہارن صاحب لکھتے ہیں۔ یہود کا یہ حکم یقیناً محض شرارت سے تھا۔ اُن کی غرض یہی ہوگی۔ کہ جب ان کے نسخے کے سوائے تمام نسخے تلف ہو جائینگے۔ تو ردّوبدل کا خاصا موقعہ مل سکے گا۔ اس لئے اس نسخہ کی نقلیں جو آٹھویں صدی کے بعد پھیلیں۔ زیادہ اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ ھذا ما وفق لی ربی والحمد للہ ربّ العالمین۔

یہ ضروری مضامین تھے جو جمع کردیئے گئے ہیں۔ والتحقیق عند اللہ۔

محمد فتح الدین از انصاری ولد حکیم غلام محمد مرحوم
خوشاب ضلع شاہپور۔ پنجاب۔
غرہ ذیقعد سنہ ۱۳۴۰ھ ہجری المبارک